ڈھونڈنے کے سوا انھیں کسی اور واسطے اور ذریعے کو تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ قرآن میں اس گھر کو جو مبارک (سرچشمۂ خیر و برکت) کہا گیا ہے، اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی دعا کن شکلوں میں پوری ہوئی

اب آیئے دیکھیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا اس سرزمین کے بسنے والوں کے لیے کن کن شکلوں میں پوری ہوئی۔

سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف بیت اللہ کو بلکہ اس سرزمین کو بھی جہاں بیت اللہ واقع ہے محترم قرار دے دیا۔ اس میں لڑنا بھڑنا، کسی پر حملہ کرنا، کسی کو قتل کرنا، سب یک قلم ممنوع ہو گیا۔ جو شخص بھی اس میں داخل ہو گیا وہ خدا کی امان میں داخل ہو گیا۔ کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں رہا کہ اس سے کسی قسم کا تعرض کر سکے۔ اس کے حدود سے باہر خطرہ ہی خطرہ تھا لیکن اس کے اندر ربِ ابراہیمؑ نے امن ہی امن پیدا کر دیا۔ یہاں تک کہ اس کے دائرے میں کسی جانور کو بھی کوئی اذیت پہنچانا حرام ٹھہرا۔ اپنے اسی احسان کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قریش کو مخاطب کر کے ان الفاظ میں فرمایا ہے۔ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّیُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِھِمْ (۶۷۔ عنکبوت) (کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لیے ایک محفوظ حرم بنا دیا درآنحالیکہ ان کے گردوپیش کا حال یہ ہے کہ لوگ دن دہاڑے اچک لیے جاتے ہیں)

اشہرِ حرم

دوسری یہ کہ اس گھر کے حج و زیارت کے لیے سال کے چار مہینے بھی محترم قرار دے دیے گئے۔ ان مہینوں میں لڑنا بھڑنا اور خونریزی و فساد بالکل ممنوع ہو گیا۔ وحشی سے وحشی لوگ بھی ان کے احترام میں اپنی تلواریں میانوں میں کر لیتے تھے اور خطرناک سے خطرناک علاقے بھی بالکل پُرامن ہو جاتے تھے تاکہ لوگ ملک کے ہر گوشے اور کونے سے حج و عمرہ کے لیے آ سکیں اور پھر امن و سلامتی کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹ سکیں۔

بیرونی خطرات سے حفاظت

تیسری یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو بیرونی دشمنوں کے خطرات سے بھی بالکل مامون و محفوظ بنایا۔ اس گھر کی تاریخ شہادت دیتی ہے کہ بیرونی دشمنوں کو اوّل تو اس پر حملہ آور ہونے کی کبھی جرأت ہی نہیں ہوئی اور اگر کبھی کسی نے یہ جسارت کی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی قدرتِ قاہرہ سے نہایت عبرت ناک سزا بھی دی ہے۔ ابرہہ کی فوجوں کا جو حشر ہوا وہ تاریخ کی بھی ایک مشہور حقیقت ہے اور اس کا ذکر قرآن کی سورۂ فیل میں بھی ہوا ہے۔

معاشی فراغت کے مختلف پہلو

اسی طرح اس گھر کی برکت نے اس سرزمین کے ساکنوں کے لیے معاشی فراغت کے دروازے بھی کھول دیے۔ اس کے بھی بعض پہلوؤں کی طرف ہم توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ مرکزِ حج قرار پا جانے کی وجہ سے اس سرزمین کی طرف لوگوں کا رجوع بہت بڑھ گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت جتنی ہی پھیلتی گئی اسی حساب سے لوگ گوشہ گوشہ سے حج و زیارت کے لیے آنے لگے۔ اور پھر اسی اعتبار سے، قدرتی طور پر، تجارت اور کاروبار کو فروغ ہوا۔ باہر سے ہر قسم

کی چیزیں مکہ کے بازار میں پہنچنے لگیں اور یہاں سے جو چیزیں باہر جا سکتی تھیں وہ باہر نکلنے لگیں۔ اس گھر کی تعمیر سے پہلے اس علاقہ میں معاش کا تمام تر انحصار جیسا کہ ہم نے ذکر کیا یا تو گلہ بانی اور شکار پر تھا یا لوٹ مار پر لیکن اب تجارت کی راہ کھل جانے کی وجہ سے ہر قسم کی اجناس اور پھل اور ضرورت کی دوسری چیزوں کی فراوانی ہوئی جس سے لوگوں کی معیشت میں ایک نہایت خوشگوار تبدیلی آگئی۔

دوسرا یہ کہ خانہ کعبہ کی تولیت کی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کو وقار و احترام کا ایک ایسا مقام حاصل ہو گیا کہ تمام عرب پر ان کی سیاسی اور مذہبی دھاک بیٹھ گئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ان کے تجارتی قافلے شام اور یمن وغیرہ تک برابر جاتے اور کوئی ان سے مزاحمت کی جرأت نہ کرتا۔ بلکہ تاریخوں سے یہاں تک پتہ چلتا ہے کہ ان کے قافلے جن شاہراہوں سے گزرتے ان پر بسنے والے قبائل ان سے تعرض کرنے کے بجائے اپنے اپنے حدود کے اندر ان کی حفاظت اور رہنمائی کے لیے بدرقہ فراہم کرتے۔ سورۂ "لِاِیْلٰفِ" میں قرآن مجید نے قریش کے انھی تجارتی سفروں کا حوالہ دے کر ان سے مطالبہ کیا ہے فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ (پس چاہیے کہ اس گھر کے رب کی وہ بندگی کریں جس نے ان کو بھوک میں کھلایا اور خطرے سے نچنت کیا) اس لیے کہ فی الواقع یہ اسی گھر کی برکت تھی کہ وہ ایک پر خطر اور چٹیل بیابان میں امن سے بھی بہرہ مند ہوئے اور ان کے لیے معاش کی راہیں بھی فراخ ہو گئیں۔

ایک سوال کا جواب

بحث کے یہ سارے پہلو تو بالکل واضح ہیں البتہ یہاں ایک بات ایسی ہے جو ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہنوں میں کھٹکے وہ یہ کہ اس موقع پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کے لیے رزق کے لیے جو دعا کی ہے وہ مخصوص طور پر پھلوں کے رزق کی دعا ہے۔ اپنی اولاد کے لیے رزق و فضل کی دعا کرنا بالخصوص جب کہ وہ ایک بے آب و گیاہ صحرا میں بسائی جا رہی ہو ایک بالکل فطری چیز ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس رزق کے لیے پھلوں کی شرط کیوں لگائی۔ ذوق تو یہ کہتا ہے کہ انھیں رزق کی ایک جامع دعا مانگ کر معاملہ اپنے رب پر چھوڑنا تھا کہ یہ رزق وہ انھیں کس شکل میں دے۔ اپنی طرف سے کسی خاص نوعیت کے رزق کی تجویز پیش کرنا ایک پیغمبر کے لیے کچھ موزوں نظر نہیں آتا۔ قرآن مجید میں دوسرے انبیاء کی یا خود حضرت ابراہیمؑ کی دوسری دعائیں جو مذکور ہیں ان پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی تخصیص و تعیین سے جو ایک تجویز کی سی شکل اختیار کر لے ان میں بالعموم احتراز فرمایا گیا ہے۔

ثمرات کا مفہوم

ہمارے نزدیک یہ کھٹک محض اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ثمرات سے مراد صرف میوہ جات ہیں حالانکہ ثمرات کے معنی صرف میوہ جات کے نہیں آتے بلکہ میوہ جات کے ساتھ ساتھ اجناس اور غلہ جات بھی اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ میوہ جات کے لیے مخصوص لفظ عربی میں فواکہ کا ہے ثمرات کا لفظ اس سے عام اور وسیع ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ اسی ابراہیمی دعا کی برکتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ثمرات کل شیء (ہر چیز کے پھل) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اَوَلَمْ نُمَکِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا یُّجْبٰٓی اِلَیْهِ

ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ (۵۷۔ قصص) (کیا ہم نے ایک مامون حرم میں ان کے قدم نہیں جمائے جہاں ہر چیز کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں)

ہم اوپر یہ ذکر کر چکے ہیں کہ یہ سرزمین جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیلؑ کو بسایا ایک چٹیل اور غیر آباد جگہ تھی۔ تورات میں اس کے لیے بیابان کا لفظ استعمال ہوا ہے اور خود حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دعا میں اس کو وادی غیر ذی زرع (بن کھیتی کی وادی) سے تعبیر کیا ہے۔ تورات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی بسر اوقات گلہ بانی اور شکار پر تھی جس کے سبب سے ان کا زیادہ تر وقت باہر بسر ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب معاش کا انحصار گلہ بانی اور شکار پر ہو تو وہ پُرسکون اور برقرار زندگی وجود میں نہیں آسکتی تھی جو بیت اللہ کی تولیت کے فرائض اور اس مشن کی تکمیل کے لیے ضروری تھی جو حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کے سپرد فرمایا تھا۔ اس وجہ سے حضرت ابراہیمؑ نے ان کے لیے یہ دعا کی کہ ان کو بدویانہ زندگی کی بے اطمینانیوں اور پریشانیوں کی جگہ حضری زندگی کا سکون و اطمینان نصیب ہو تاکہ وہ توحید اور عبادتِ الٰہی کے اس عالم گیر مرکز کی پوری دلجمعی کے ساتھ خدمت کر سکیں جس کی خدمت پر وہ مامور کیے گئے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا سورۂ ابراہیمؑ میں بھی نقل ہوئی ہے۔ وہاں کچھ الفاظ زیادہ ہیں جن سے وہ حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ فرمایا۔

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ	اے ہمارے رب میں نے اپنی اولاد میں سے بعض
غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ	کو ایک بن کھیتی کی زمین میں تیرے محترم گھر کے پاس
رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً	بسایا ہے۔ اے ہمارے رب، میں نے اس لیے بسایا
مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ	ہے تاکہ یہ نماز قائم کریں پس تو لوگوں کے دل ان کی
مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ	طرف مائل کردے اور ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما
(۳۷۔ ابراھیم)	تاکہ یہ تیرا شکر ادا کرتے رہیں۔

اس دعا کے الفاظ پر اچھی طرح غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ اور ان کی اولاد کے لیے یہاں اپنے رب سے دو چیزوں کی درخواست کی ہے اور اس درخواست کے حق میں دو چیزوں کو بطور سفارش پیش کیا ہے۔ درخواست تو یہ پیش کی ہے کہ تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کردے اور ان کو پھلوں کی روزی دے اور اس کے حق میں سفارش یہ پیش کی ہے کہ یہ سرزمین زراعت سے بالکل محروم سرزمین ہے لیکن میں نے اپنی اولاد کو صرف اس لیے یہاں لا ڈالا ہے کہ یہ تیرے محترم گھر کی خدمت کریں اور تیری بندگی کی دعوت کے لیے نماز قائم کریں۔ غور کیجیے کہ جب ثمرات کی روزی کے لیے وہ وجہ یہ پیش کرتے ہیں کہ یہ بن کھیتی کی زمین ہے تو ان کا مدعا ثمرات سے صرف میوہ جات تو نہیں ہوسکتے بلکہ یہی ہوسکتا ہے کہ یہ گلہ بانی اور شکار کی بدویانہ زندگی کی بے اطمینانیوں سے چھوٹ کر حضری زندگی کے سکون سے بہرہ مند

ہوں کہ تیرے گھر اور تیرے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکیں۔ آیت کے آخر میں لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ کے جو الفاظ آئے ہیں وہ بھی نہایت معنی خیز ہیں یعنی میں ان کے لیے جو سکون کی زندگی settled life کا طالب ہوں تو اس لیے نہیں کہ ان کے لیے سامانِ عیش کی فراوانی چاہتا ہوں بلکہ صرف اس لیے اس کا طالب ہوں کہ وہ اپنے مشن کے لیے یکسو رہ کر زیادہ سے زیادہ تیری شکر گزاری کا حق ادا کر سکیں۔

حضرت ابراہیمؑ کی شرط

مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ الآیۃ۔ حضرت ابراہیمؑ نے رزق کے لیے جو دعا فرمائی اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دی کہ اس کے حق دار صرف وہی لوگ ٹھہریں جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہوں۔ یقیناً یہاں یہ پیش بندی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس لیے فرمائی کہ اوپر امامت وخلافت کے معاملہ میں ان کو یہ صاف جواب مل گیا تھا کہ اس عہد کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہ ہوگا جو شرک وکفر میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہ بات سامنے تھی اس وجہ سے حضرت ابراہیمؑ نے اس پر قیاس کر کے یہاں اپنی دعا میں از خود یہ قید لگا دی کہ میں یہ درخواست صرف اہلِ ایمان کے لیے کر رہا ہوں۔ اس سے حضرت ابراہیمؑ کے اس مرتبۂ تسلیم ورضا کا اندازہ ہوتا ہے جس پر وہ فائز تھے۔ اشارہ بھی اگر مل گیا ہے کہ فلاں سمت میں رب کی رضا ہے تو جھپٹ کر ادھر کو چل پڑے ہیں، اگرچہ اس اشارہ کا مطلب بعد میں کچھ اور ہی واضح ہوا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ امامت وخلافت اور معیشتِ دنیا کے معاملات کو ایک دوسرے پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ جو لوگ خدا کے نافرمان ہیں وہ خدا کی خلافت کے سزاوار تو ہرگز نہیں ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کی نافرمانی کے سبب سے خدا ان کی روزی بھی چھین لے۔ روزی اللہ تعالیٰ نافرمانوں اور فرمانبرداروں دونوں کو اس حیاتِ چند روزہ میں دیتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس زندگی میں جو لوگ اس کے رزق سے نافرمانی کرتے ہوئے متمتع ہوتے ہیں ان کو مرنے کے بعد وہ دوزخ میں جھونک دے گا۔ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہے وہ بڑی وضاحت کے ساتھ آگے مختلف سورتوں میں بیان ہوگی اس وجہ سے یہاں ہم صرف اجمالی اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۱۲۷)

تعمیر کعبہ کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی دعا

قواعد، قاعدہ کی جمع ہے۔ قاعدہ کے معنی بنیاد اور اساس کے ہیں۔ اوپر والی آیت میں اس گھر کی تعمیر کے حکم کا حوالہ تھا۔ اب آگے یہ یاد دلایا جا رہا ہے کہ اس کی بنیادیں اٹھاتے وقت حضرت ابراہیمؑ وحضرت اسماعیلؑ نے کیا دعا کی تھی، اس گھر کے ساتھ ان کی کیا آرزوئیں اور تمنائیں وابستہ تھیں اور مستقبل میں اس سے کس فیضِ عالم گیر کے جاری ہونے کی انھوں نے اپنے پروردگار سے التجا کی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت کا یہ حصہ صرف قرآن کے ذریعہ سے ہمارے علم میں آیا ہے، اس لیے کہ یہود نے جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا تورات سے خاص اس حصہ کو یا تو حذف کر دیا یا اس میں اپنے حسبِ منشا تحریف کر دی۔ لیکن یہ آپ کی سرگزشت

کا ایک ایسا ضروری حصّہ ہے کہ اس کے بغیر یہ بالکل ناتمام معلوم ہوتی ہے۔ قرآن نے یہ تحریف کردہ حصّہ بے نقاب کر کے اس کی تکمیل کر دی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ، اے ہمارے رب ہماری طرف سے قبول کر، کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ تیری عبادت اور تیری بندگی کی دعوت کے لیے یہ گھر جو ہم بنا رہے ہیں اس کو شرفِ قبولیت بخش اور ہماری یہ خدمت قبول فرما اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہم تیرے گھر کی بنیادیں اٹھاتے وقت کچھ التجائیں پیش کرتے ہیں ہماری یہ التجائیں قبول فرما۔ ہم اس دوسرے مطلب کو ترجیح دیتے ہیں۔ اول تو اس وجہ سے کہ اس صورت میں یہ جملہ خاص خانہ کعبہ سے متعلق ہونے کے بجائے اس پوری دعا کی تمہید بن جاتا ہے جو آگے آ رہی ہے، دوسرے جہاں تک خانہ کعبہ کی تعمیر کا تعلق ہے یہ کام حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق کر رہے تھے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اس وجہ سے اس کی قبولیت پہلے سے معلوم تھی۔ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ میں خدا کی ان دو صفتوں کا حوالہ ہے، جن پر اعتماد کر کے بندہ خدا سے دعا کرتا ہے اور اس کے اندر حصر کا جو مضمون ہے وہ دعا کرنے والوں کی طرف سے کامل سپردگی اور کامل اعتماد کا اظہار ہے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۱۲۸)

دعا کی وضاحت

دُعا کے بیچ بیچ میں بار بار رَبَّنَا کا اعادہ اور دعا کے مناسب صفاتِ الٰہی کا حوالہ دعا کے آداب میں سے ہے۔ اس سے دعا شرفِ قبولیت حاصل کرتی ہے۔ یہ دعا ان دونوں چیزوں کے حکیمانہ استعمال کی بہترین مثال ہے۔

سب سے پہلے باپ بیٹے دونوں نے جس چیز کی دعا کی ہے وہ خود اپنے مسلم بنائے جانے کی ہے۔ مسلم کے معنی خدا کے کامل فرمانبردار کے ہیں۔ اس سے کئی حقیقتیں روشنی میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایمان و اسلام اور طلبِ خشیت و تقویٰ کی دعاؤں میں انسان سب سے پہلے اپنے آپ کو سامنے رکھے، یہ چیزیں ایسی نہیں جن سے کوئی بھی مستغنی ہو سکے اگرچہ وہ کتنا ہی عالی مقام ہو۔ دوسری یہ کہ اسلام کے درجات و مراتب کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیل جیسے مسلم کامل بھی جن کے ذریعہ سے دنیا اسلام کے نام اور اس کی روح سے آشنا ہوئی اپنے مسلم بنائے جانے کے لیے دعا کرتے تھے، تیسری حقیقت، جو خاص اس موقع سے تعلق رکھنے والی اور نظمِ کلام کو کھولنے والی ہے، یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے اپنی زندگی کے سب سے زیادہ تاریخی موقع پر، جب کہ وہ اپنے مشن کا مرکز تعمیر کر رہے تھے، اپنے لیے جس چیز کی دعا کی تھی، مسلم بنائے جانے کی تھی نہ کہ یہودی یا نصرانی بنائے جانے کی۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ۔ اپنے مسلم بنائے جانے کی دعا کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت

اسماعیلؑ نے اپنی ذریت کے اندر سے ایک پوری امتِ مسلمہ اٹھائے جانے کی بھی اس موقع پر دعا فرمائی۔ اس دعا میں چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ان کی ذریت میں سے صرف حضرت اسماعیلؑ شریک تھے۔ اس وجہ سے اس کا واضح مفہوم یہی ہو سکتا ہے کہ یہ انہی کی اولاد سے متعلق تھی چنانچہ انہی کی نسل کے اندر محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ظہور ہوا اور آپ کی دعوت سے وہ امتِ مسلمہ ظہور میں آئی جس کے لیے یہ دعا کی گئی تھی۔ تورات سے یہ چیزیں تو غائب کر دی گئیں لیکن قربان ہونے والے فرزند سے متعلق یہ پیشین گوئی موجود ہے کہ تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی۔

نفظ ارات کا مفہوم

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا۔ اَرِنَا کے اصل معنی "ہمیں دکھا" کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین اور اپنی شریعت کی طرف اپنے بندوں کی رہنمائی اس طرح کی وحی کے ذریعہ سے بھی کرتا ہے جس کا مظہر قرآن مجید ہے اور کبھی رویا یا کشف میں براہِ راست اپنا کوئی فرشتہ بھیج کر اس کام کو عملاً دکھا یا بتا بھی دیتا ہے جو مطلوب ہوتا ہے۔ اس قسم کی رہنمائی قرآن مجید کی اصطلاح میں اراءت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء تشریف لائے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی رہنمائی زیادہ تر اراءت ہی کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ یعنی یا تو رویا میں ان کو ایک بات دکھا دی جاتی تھی یا کوئی فرشتہ خداوندی ظاہر ہو کر مطلوب کام کی طرف رہنمائی کر دیتا تھا۔ تورات سے اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہاں دعا میں حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ نے اسی اراءت کی درخواست کی ہے۔

مناسک کی تحقیق

مناسک، منسک کی جمع ہے۔ نسک کے اصل معنی دھونے اور پاک کرنے کے ہیں۔ نَسَکَ الثَّوْب کے معنی ہیں کپڑے کو دھو کر پاک کیا۔ اسی سے نُسک ہے جس کے معنی قربانی کے ہیں۔ قربانی بندے کو گناہ کی آلودگیوں اور آلائشوں سے پاک کر کے اللہ تعالیٰ کا تقرب عطا کرتی ہے۔ پھر اسی سے منسک ہے، جس کے معنی قربانی کے طریقے کے بھی ہیں اور قربان گاہ کے بھی۔ اس کی جمع مناسک ہے جو حج کے تمام سلسلۂ عبادات و مراسم پر حاوی ہے۔ فرمایا ہے۔ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ ۲۰۰۔ بقرہ (جب تم حج کے مراسم ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو۔

توبہ کا مفہوم

وَتُبْ عَلَيْنَا۔ توبہ کے اصل معنی رجوع کرنے اور متوجہ ہونے کے ہیں اس کا صلہ جب علیٰ کے ساتھ آتا ہے تو یہ جیسا کہ آیت ۳۷ کی وضاحت کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں اس بات پر دلیل ہوتا ہے کہ اس کے اندر رحم کا مضمون پوشیدہ ہے۔ رحم کے اس پوشیدہ مضمون کو یہاں اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ کہہ کر کھول بھی دیا ہے۔ بندہ جب اپنے رب کی طرف خشیت کے ساتھ رجوع کرتا ہے تو رب رحیم رحمت کے ساتھ بندے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱۲۹)

دعا کا تعلق ذریتِ اسماعیلؑ سے ہے

ان میں انھی میں سے ایک رسول اٹھا، یعنی ہماری ذریت میں سے۔ چونکہ اس موقع پر حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ صرف حضرت اسماعیلؑ ہی تھے اور وہی اس وادیٔ غیر ذی ذرع میں بسائے جا رہے تھے اس وجہ سے اس دعا کا تعلق لازماً انھی کی ذریت سے تھا۔ اس کا کوئی تعلق بھی حضرت اسحاقؑ کی ذریت سے نہیں ہو سکتا۔ تورات کے الفاظ سے بھی یہی بات نکلتی ہے کہ آخری نبی کی بعثت حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے ہونے والی تھی۔ تثنیہ باب ۱۸ میں حضرت موسیٰؑ کی جو مشہور پیشین گوئی ہے اس میں فرمایا ہے: "تیرے ہی بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کرے گا"۔ آگے چل کر ہے "میں ان کے لیے انھیں کے بھائیوں میں سے"۔ یہ الفاظ صاف اشارہ کر رہے ہیں کہ اس سے مراد بنی اسماعیل ہی ہیں۔ اگر بنی اسرائیل مراد ہوتے تو صحیح تعبیر "انھی کے بھائیوں میں سے" کے بجائے "انھی میں سے" کی ہوتی۔ اسی طرح "تیرے ہی بھائیوں میں سے" کی جگہ "تمھارے ہی اندر سے" کے الفاظ وارد ہوتے۔ علاوہ ازیں یہاں "میری مانند" کے الفاظ بھی قابلِ لحاظ ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس نبی کی بعثت کی پیشین گوئی کی گئی تھی ایک صاحبِ رسالت رسول کی تھی۔ قرآن مجید کی مذکورہ دعا میں اسی لحاظ سے رسول کا لفظ وارد ہوا ہے۔ ہم آگے کسی مناسب موقع پر رسول اور نبی کے فرق کو ظاہر کریں گے۔

یہاں جس رسول کی بعثت کے لیے دعا کی گئی ہے، اس کے تین مقاصد بتائے گئے ہیں، ایک تلاوتِ آیات، دوسرا تعلیم کتاب و حکمت، تیسرا تزکیہ۔

'تلاوتِ آیات' کا مفہوم

آیت لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں، جس سے کسی چیز پر دلیل لائی جا سکے۔ اس پہلو سے آسمان و زمین کی ہر چیز آیت ہے، اس لیے کہ ان میں سے ہر چیز خدا کی قدرت و حکمت اور اس کی مختلف صفات خلق و تدبیر پر ایک دلیل ہے۔ اسی طرح وہ معجزات بھی آیت ہیں جو انبیاء علیہم السلام سے ظاہر ہوئے اس لیے کہ وہ بھی اپنے پیش کرنے والوں کی سچائی پر دلیل تھے۔ علیٰ ہذا القیاس قرآن مجید کے الگ الگ جملوں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس لیے کہ فی الحقیقت ان میں سے ہر آیت کی حیثیت ایک دلیل و برہان کی ہے جس سے خدا کی صفات اور اس کے احکام و قوانین اور اس کی مرضیات کا علم ہوتا ہے۔

يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ کے الفاظ سے اس زور اور اختیار کا اظہار ہو رہا ہے، جس سے مسلح ہو کر خدا کا ایک رسول اس دنیا میں آتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ رسول محض ایک خوش الحان قاری کی طرح لوگوں کو قرآن سنانے نہیں آتا، بلکہ وہ خدا کے سفیر کی حیثیت سے لوگوں کو آسمان و زمین کے خالق و مالک کے احکام و فرامین اور اس کے دلائل و براہین سے آگاہ کرتا ہے۔ علاوہ ازیں وحی الٰہی کے لیے آیات کے لفظ سے اس حقیقت کا بھی اظہار ہو رہا ہے کہ خدا کا دین تحکّم اور جبر پر مبنی نہیں ہے بلکہ یہ تمام تر دلائل و براہین پر مبنی ہے اور اس کے ہر ٹکڑے کے اندر اس کی دلیل ہے۔

'تعلیم کتاب و حکمت' کا مفہوم

اب آیئے تعلیم کتاب و حکمت کے الفاظ پر غور فرمایئے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ تعلیم، تلاوت

سے ایک بالکل مختلف چیز ہے۔ تلاوت آیات تو یہ ہوئی کہ رسول نے لوگوں کو آگاہ کر دیا کہ خدا نے اس کے اوپر یہ وحی نازل کی ہے۔ تعلیم یہ ہے کہ نہایت شفقت و توجہ کے ساتھ ہر استعداد کے لوگوں کے لیے اس کی مشکلات کی وضاحت کی جائے، اس کے اجمالات کی تشریح کی جائے، اس کے مقدرات کھولے جائیں اور اس کے مضمرات بیان کئے جائیں اور اس توضیح و بیان کے بعد بھی اگر لوگوں کے ذہن میں سوالات پیدا ہوں تو ان کے سوالوں کے جواب دیے جائیں۔ مزید برآں لوگوں کی ذہنی تربیت کے لیے خود ان کے سامنے سوالات رکھے جائیں اور ان کے جوابات معلوم کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ لوگوں کے اندر فکر و تدبر کی صلاحیت اور کتاب الٰہی پر غور کرنے کی استعداد پوری طرح بیدار ہو جائے۔ یہ ساری باتیں تعلیم کے ضروری اجزا میں سے ہیں اور ہر شخص جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کیا ہے اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ آپ نے اپنے صحابہؓ کے لیے تعلیم کتاب کے یہ تمام طریقے اختیار فرمائے۔

تعلیم کے ساتھ یہاں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک کتاب کا دوسری حکمت کا۔

حکمت کی تحقیق

کتاب سے مراد تو ظاہر ہے کہ قرآن مجید ہے۔ اس لفظ کی تحقیق ہم اس سورہ کی آیت ۲ کی تفسیر کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں۔ لفظ حکمت کی تحقیق مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب مفردات القرآن میں جو بیان فرمائی ہے اس کا ضروری حصہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

> رہی حکمت تو وہ تعبیر ہے اس قوت و صلاحیت کی جس سے انسان معاملات کا فیصلہ حق کے مطابق کرتا ہے۔ حضرت داؤدؑ کی تعریف میں ارشاد ہوا ہے وَاٰتَیْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ (ہم نے اس کو حکمت عطا کی اور فیصلۂ معاملات کی صلاحیت) یہاں فصل الخطاب کے لفظ سے اس اثر کو بیان کیا ہے جو حکمت کا ثمرہ ہے۔ جس طرح فیصلۂ معاملات کی صلاحیت حکمت کے ثمرات میں سے ہے۔ اسی طرح اخلاق کی پاکیزگی اور تہذیب بھی اس کے ثمرات میں سے ہے۔ اسی وجہ سے اہل عرب حکمت کا لفظ انسان کی اس قوت و صلاحیت کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں جو عقل و رائے کی پختگی اور شرافت اخلاق کی جامع ہوتی ہے۔ چنانچہ دانش مند اور مہذب آدمی کو حکیم کہا جاتا ہے اور جو بات عقل اور دل دونوں کے نزدیک بالکل واضح ہو اس کو حکمت سے تعبیر کرتے ہیں۔

حکمت کا ذکر یہاں کتاب کے ساتھ اس بات پر دلیل ہے کہ تعلیم حکمت تعلیم کتاب سے ایک زائد شے ہے اگرچہ یہ حکمت سر تا سر قرآن حکیم ہی سے ماخوذ و مستنبط ہو۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک جو لوگ حکمت سے حدیث مراد لیتے ہیں، ان کی بات میں بڑا وزن ہے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ حکمت چونکہ حکیمانہ بات کو بھی کہتے ہیں اور حکیمانہ بات کہنے کی صلاحیت کو بھی، اس وجہ سے تعلیم حکمت کے معنی جس طرح کسی کو کوئی حکیمانہ بات بتا دینے کے ہیں اسی طرح اس کے معنی لوگوں کے اندر حکمت کی صفت و صلاحیت پیدا کرنے کے بھی ہیں۔

'تزکیہ' کا مفہوم

رسول کا تیسرا مقصد تزکیہ بتایا گیا ہے۔ لفظ تزکیہ دو مفہوموں پر مشتمل ہے۔ ایک پاک و صاف کرنے پر، دوسرے نشوونما دینے پر، ہمارے نزدیک یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ جو چیز

مخالف ومزاحم زوائد ومفاسد سے پاک ہوگی وہ لازماً اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق پروان بھی چڑھے گی۔ انبیاء علیہم السلام نفوسِ انسانی کا جو تزکیہ کرتے ہیں اس میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ لوگوں کے دلوں اور ان کے اعمال و اخلاق کو غلط چیزوں سے پاک صاف بھی کرتے ہیں اور ان کے اعمال و اخلاق کو نشوونما دے کر ان میں مفاسد اور مخالف ومزاحم چیزوں کے بالمقابل استقلال کے ساتھ سینہ سپر رہنے اور استقامت دکھانے کی قوت بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کتاب کے مقابلہ میں نفوس کا تزکیہ کہیں زیادہ دیدہ ریزی، مشقت اور صبر و ریاض کا طالب ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس کا ذکر تمام دین و شریعت کے غایت و مقصد کی حیثیت سے ہوا ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت ہم انشاء اللہ آگے کسی موزوں مقام پر کریں گے۔

'عزیز' اور 'حکیم' کا مفہوم

آیت کے خاتمہ پر خدا کی دو صفتوں — عزیز و حکیم — کا حوالہ ہے۔ عزیز کے معنی غالب اور عزت و قوت والے کے ہیں۔ یعنی وہ ذات جو پوری قوت وصولت اور پورے اختیار و اقتدار کے ساتھ اس کائنات پر فرمانروائی کر رہی ہے — حکیم کے معنی ہیں جس کے ہر کام میں حکمت، مصلحت اور مقصد و غایت ہو۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی ان دونوں صفتوں کا حوالہ بالعموم ایک ساتھ آتا ہے۔ اس سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات پر پوری قوت اور پورے غلبہ کے ساتھ حاوی اور متصرف ہے لیکن اس کے اس غلبہ و اقتدار کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اس کے زور میں جو چاہے کر ڈالے، بلکہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے حکمت و مصلحت کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کا کوئی کام بھی حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔

یہاں ان دونوں صفتوں کا حوالہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ جو خدا عزیز و حکیم ہے، اس کی عزت و حکمت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی پیدا کی ہوئی اس مملکت میں اپنا سفیر اور پیغمبر بھیجے جو اس کی رعیت کو اس کے احکام و قوانین سے آگاہ کرے اور ان کو شریعت اور حکمت کی تعلیم دے۔

وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّۃِ اِبْرٰہٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِہَ نَفْسَہٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰہُ فِی الدُّنْیَا ۚ وَاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ (۱۳۰)

رَغِبَ کا صلہ جب عَنْ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی کسی چیز سے بے رغبت اور بیزار ہونے کے ہوتے ہیں۔

لفظ 'سَفِہَ' کی تحقیق

سَفِہَ زیادہ تر لازم آتا ہے۔ لیکن متعدی بھی آتا ہے۔ مثلاً سَفِہَ نَفْسَہٗ کے معنی ہوں گے اس نے اپنا نصیبہ بگاڑ لیا۔ سَفِہَ رَاْیَہٗ کے معنی ہوں گے اس نے احمقانہ رائے اختیار کی۔ اسی طرح سَفِہَ نَفْسَہٗ کے معنی ہوں گے۔ اس نے اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کیا۔

یہ اسلوبِ کلام اظہارِ تعجب اور اظہارِ افسوس دونوں کا جامع ہے۔ اشارہ یہاں یہود کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ ملتِ ابراہیمؑ کے پیرو ہونے کے مدعی ہیں، بلکہ اپنے زعم میں اس کے

واحد اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں، دوسری طرف ان کا یہ حال ہے کہ جو پیغمبر ملتِ ابراہیمؑ کا داعی بن کر آیا ہے اس سے اور اس کی دعوت سے یہ سب سے زیادہ بیزار ہیں اور ان لوگوں کو بے وقوف قرار دے رہے ہیں۔ جو اس دعوت کا ساتھ دے رہے ہیں۔ حماقت اور خود باختگی کی اس سے بڑھ کر مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا (اور ہم نے دنیا میں اس کو برگزیدہ ٹھہرایا) یہ اس برگزیدگی کی طرف اشارہ ہے جو ان کو دنیا کی قوموں کی سرداری و پیشوائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بخشی اور جس کا ذکر اوپر آیت ۱۲۴ میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے سب کی امامت کے لیے منتخب فرمایا، احمق ہی ہو گا جو اس کی ملت کی پیروی سے اعراض اختیار کرے گا۔

صالحین کا لفظ قرآن مجید میں عام نیکوکاروں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے اور اس پورے زمرے کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، جو انبیاء، صدیقین اور شہداء اور صالحین سب پر مشتمل ہے۔ اس آیت میں یہ لفظ اسی دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۳۱)

اسلام کا مفہوم

اسلام کے معنی اپنے آپ کو پورے طور پر خدا کی مرضی اور اس کے احکام کے حوالہ کر دینا ہے۔ یہاں ہمارے نزدیک اس سے بیٹے کی قربانی کی طرف اشارہ ہے۔ یوں تو وہ تمام امتحانات، جن سے وہ گزارے گئے ان کے اسلام کی جانچ ہی کے لیے تھے، گویا ہر امتحان زبانِ حال سے ان کے سامنے "اَسْلِمْ" ہی کا مطالبہ رکھنے کے لیے نمودار ہوا لیکن خاص طور پر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کا حکم جس میں کامیابی کے بعد وہ برگزیدگی اور امامت کی عزت سے نوازے گئے ہیں، کامل سپردگی اور کامل حوالگی کا ایک ایسا مطالبہ تھا جس کی تعبیر کے لیے سب سے زیادہ جامع اور حقیقت افروز لفظ اگر کوئی ہو سکتا تھا تو "اَسْلِمْ" ہی کا لفظ ہو سکتا تھا۔ یہ لفظ واقعہ قربانی کی طرف اشارہ کرنے کے لیے قرآن مجید میں بعض دوسرے مقامات میں بھی آیا ہے مثلاً فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۱۰۳۔ صافات (پس جب باپ اور بیٹے دونوں نے اپنے آپ کو اپنے رب کے حوالے کر دیا اور ابراہیمؑ نے اسمٰعیلؑ کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا)

یہاں اس واقعہ کی طرف اسلام کے لفظ سے اشارہ کر کے قرآن نے کئی حقیقتیں واضح کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت دونوں میں جو برگزیدگی بخشی وہ، جیسا کہ آیت ۱۲۴ میں اشارہ ہو چکا ہے، ان کی ان جان بازیوں اور قربانیوں کا صلہ ہے جو انھوں نے رب کی رضا طلبی کی راہ میں کیں۔ یہ عظمت ان کو مفت میں نہیں حاصل ہوئی جس طرح یہود اس کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کو کامل سپردگی اور کامل حوالگی یعنی اسلام کا حکم ہوا تھا اور انھوں نے اپنے قول و عمل سے اسی اسلام کا مظاہرہ کیا نہ کہ یہودیت یا نصرانیت کا جیسا کہ یہود یا نصاریٰ گمان کرتے ہیں۔ تیسری یہ کہ اسلام کی اصل روح اپنے آپ کو اپنے رب کے حوالہ کر دینا ہے

یہاں تک کہ کوئی عزیز سے عزیز چیز بھی بندے کے نزدیک خدا سے زیادہ عزیز نہ رہ جائے۔

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۭ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۱۳۲)

تَوْصِيَہ کے معنی تعلیم و تلقین کرنے کے ہیں، عام اس سے کہ یہ تعلیم و تلقین کوئی شخص اپنی وفات کے وقت کرے یا زندگی کے کسی دوسرے مرحلہ ہیں۔

بِهَآ میں ضمیر ملت اسلام کے لیے ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں مِلَّةِ اِبْرٰهٖمَ کے لفظ سے ہوا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی وصیت

حضرت ابراہیمؑ کی اس وصیت کا ذکر اگرچہ یہود کے صحیفوں میں کہیں نہیں ملتا لیکن ظاہر ہے کہ دین کے معاملہ میں اپنی اولاد اور اپنے اتباع کو وصیت و نصیحت انبیاء علیہم السلام کی عام سنت رہی ہے۔ بنی اسرائیلؑ بنی اسماعیل کے عام بزرگانِ خاندان اور سردارانِ قبائل سے متعلق بھی اس طرح کی تلقین و نصیحت کی بکثرت روایات منقول ہیں۔ یہاں تک کہ تالمود میں ایک وصیت حضرت یعقوبؑ کی بھی قرآن مجید کی بیان کردہ وصیت سے ملتی جلتی موجود ہے۔ خاندانوں اور ملتوں میں اس طرح کی روایات خاندانوں کے اکابر ہی کے طرزِ عمل سے قائم ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے یہ بات بالکل قرینِ قیاس ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خود اپنے طرزِ عمل سے اپنے بعد والوں کے لیے یہ سنت چھوڑی ہو۔ رہی یہ بات کہ انھوں نے اپنی اولاد کو ملتِ اسلام کی وصیت کی تو یہ اس قدر واضح ہے کہ اس کے لیے کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ اوپر ان کی جو سرگزشتِ حیات بیان ہوئی ہے اس سے یہ واضح ہے کہ وہ جس ملت سے آشنا ہوئے، جس ملت کی انھوں نے دعوت دی اور اپنی عظیم قربانی سے جس ملت کی حقیقت کا انھوں نے مظاہرہ کیا، وہ اسلام ہے، تو پھر وہ اس ملت کو چھوڑ کر اپنی اولاد کو یہودیت یا نصرانیت کی تلقین کس طرح کرتے جن سے وہ سرے سے آشنا ہی نہیں ہوئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ حضرت یعقوب کا ذکر یہاں اس خصوصیت کی وجہ سے ہوا کہ بنی اسرائیل براہ راست انھی کی اولاد تھے۔ مطلب یہ ہوا کہ روایت اگر ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نیچے تین پشتوں تک برابر ملتِ اسلام ہی کی وصیت کی ہے نہ کہ یہودیت و نصرانیت کی، تو ملتِ ابراہیمی کی پیروی کے مدعیوں کے لیے پیروی کی چیز اسلام ہے یا یہودیت اور نصرانیت؟

'الدین' سے مراد

اَلدِّيْن سے مراد وہ دینِ حقیقی ہے جو شروع سے اللہ کا دین ہے یعنی اسلام۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا ہے۔ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۱۹۔ آل عمران (حقیقی دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے) ایک جگہ ارشاد ہے۔ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۸۳۔ آل عمران (کیا وہ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں، حالانکہ

آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں طوعاً یا کرہاً سب اسی کے مطیع ہیں اور سب اسی کی جانب لوٹیں گے (یہی دین اللہ کا دین ہے اور یہی دین اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے ہمیشہ بھیجا۔ اسی دین کی پیروی اور اسی پر جینے اور مرنے کی وصیت حضرت ابراہیمؑ و حضرت یعقوبؑ نے اپنی اپنی اولاد کو فرمائی لیکن بعد میں بنی اسرائیل نے اس میں تحریف کر کے اس کا حلیہ بگاڑ ڈالا اور اس کی جگہ یہودیت و نصرانیت کے فتنے کھڑے کر دیے۔

فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (پس تم نہ مرنا مگر حالتِ اسلام پر) میں یہ مضمون پوشیدہ ہے کہ اس دین کی امانت ایک بھاری امانت ہے، اس امانت کا حق تمہیں مہد سے لے کر لحد تک ادا کرنا ہے۔ اس راہ میں بڑی بڑی آزمائشیں پیش آتی ہیں اور تمہیں ان آزمائشوں کا پورے عزم و ہمت سے مقابلہ کرنا ہے، خیال رکھنا، شیطان تمہیں کسی مرحلہ میں اس مقام سے ہٹانے نہ پائے۔ تمہیں اسی کے لیے جینا اور اسی کے لیے مرنا ہے۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ۭ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَاۗىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰــهًا وَّاحِدًا ښ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۱۳۳)

حضرت یعقوبؑ کی وصیت

یہ سوال کا انداز مخاطب کو متنبہ کرنے اور تقریر کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے اختیار فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم دعویٰ کرتے ہو کہ تمہارے بزرگ آباء و اجداد یہودیت یا نصرانیت پر تھے تو کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کا آخری وقت آیا اور انھوں نے اپنے بیٹوں کو وصیت کے لیے بلایا ہے۔ اس وقت انھوں نے ان سے کس چیز کا اقرار لیا۔ توحید اور اسلام کا یا یہودیت اور نصرانیت کا؟ اس سوال کے بعد قرآن نے حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنے بیٹوں سے سوال اور ان کے بیٹوں کا متفقہ جواب نقل کیا ہے جو صاف صاف دینِ توحید و اسلام کے حق میں ہے۔ یہود کے لٹریچر میں بھی اس وصیت سے متعلق جو روایت ملتی ہے اس کے الفاظ اگرچہ قرآن کے الفاظ سے کچھ مختلف ہیں لیکن ان سے تائید بہرحال قرآن ہی کے بیان کی نکلتی ہے نہ کہ بنی اسرائیل کے مذکورہ دعوے کی۔ اس لیے کہ اس میں یہودیت یا نصرانیت کی طرف کوئی اشارہ بھی موجود نہیں ہے[1]۔

---

[1] ہمارے مخدوم مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے یہود کے لٹریچر سے تلاش کر کے اس موقع پر اپنی تفسیر میں دو حوالے نقل کیے ہیں، ایک حضرت اسحاقؑ کی وصیت سے متعلق ہے، دوسرا حضرت یعقوبؑ کی وصیت سے متعلق۔

"جب اسحاقؑ نے دیکھا کہ اس کا وقت موعود آپہنچا تو انھوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ میں تمہیں خدائے تعالیٰ کا واسطہ دیتا ہوں جس کی صفات اعلیٰ، عظیم، قیوم، عزیز ہیں۔ اور جو آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی ہر چیز کا خالق ہے کہ تم خوف اسی کا رکھنا اور عبادت اسی کی کرنا۔" گنزبرگ کی قصص یہود جلد اول ص۴۱۶ (باقی بر ص۳۴۶)

حضرت یعقوبؑ کی وصیت کے حوالے کی حکمت

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ ہے کہ قرآن نے خاص طور پر حضرت یعقوب علیہ السلام کے وقتِ موت کی وصیت کا حوالہ دیا ہے جس سے کئی باتوں کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ ایک تو اس بات کی طرف کہ حضرت یعقوبؑ نے یہ عہد و اقرار اپنی اولاد سے اپنے بالکل آخری لمحاتِ زندگی میں لیا ہے[1] اس وجہ سے یہ گمان کرنے کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس کے بعد ان کے مسلک و مذہب میں کوئی تبدیلی واقع ہوگئی ہو۔ دوسری اس بات کی طرف کہ ایک شفیق و مہربان باپ، جو خدا کا ایک پیغمبر بھی ہے، اپنی اولاد سے جو عہد و اقرار اپنے بالکل آخری لمحاتِ زندگی میں لیتا ہے، اس کے اور اس کی اولاد کے درمیان سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والا واقعہ وہی عہد و اقرار ہو سکتا ہے اور باوفا اولاد کا یہ سب سے بڑا اور سب سے مقدس فرض ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات کے اندر اس عہد کو نباہے، صرف ناخلف اولاد ہی اس نوعیت کے عہد و اقرار کی خلاف ورزی کرتی ہے۔ تیسری یہ کہ اللہ سے ڈرنے والے اور اپنی اولاد سے سچی محبت کرنے والے ایک باپ کا زندگی میں اپنی اولاد سے متعلق آخری فریضہ یہ ہے کہ وہ مرتے دم ان کی دنیا سے زیادہ ان کی آخرت کی فکر کرے اور ان کو دینِ حق پر قائم رہنے اور اسی دین پر جینے اور مرنے کی تلقین کرے۔

وصیت اور اس کے جواب کے بعض دقیق پہلو

حضرت یعقوب علیہ السلام نے مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ (تم میرے بعد کس چیز کی عبادت کرو گے؟) میں سوال کے لیے مَا کا لفظ استعمال کر کے سوال میں زیادہ سے زیادہ وسعت پیدا کر دی تاکہ جواب دینے والوں کے ذہن میں معبود سے متعلق اگر کوئی تردد ہو تو وہ اس سوال کے جواب میں ظاہر ہو جائے لیکن ان کے بیٹوں کا جواب واضح کرتا ہے کہ اس وقت تک ان کے ذہن میں معبود سے متعلق کوئی الجھن موجود نہیں تھی انہوں نے نہایت واضح الفاظ میں اس کی توحید کا بھی اقرار کیا اور اسی کو سزاوارِ عبادت اور سزاوارِ اطاعت قرار دیا۔

اس آیت میں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ حضرت یعقوب کی اولاد نے اس موقع پر جس احساسِ فخر و اعتماد کے ساتھ حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے آبا و اجداد میں گنایا ہے، اسی فخر و اعتماد کے ساتھ انھوں نے حضرت اسماعیلؑ کا بھی حوالہ دیا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے زمانے تک ان کی اولاد کے اندر حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی ذریت کے خلاف وہ تعصبات نہیں پیدا ہوئے تھے جو بعد میں پیدا ہو گئے۔

---

[1] "یعقوب نے اپنے بیٹوں سے کہا، مجھے اندیشہ ہے، کہ تم میں سے کوئی بت پرستی کا میلان رکھتا ہے۔ اس کے جواب میں بارہ بیٹوں نے کہا، سن اے اسرائیل اے ہمارے باپ، ہمارا خدا وہی خدائے لم یزل ہے، جس طرح تیرا دلی ایمان ایک خدا پر ہے۔ اسی طرح ہم سب کا دلی ایمان ایک خدا پر ہے۔"

گنز برگ کی قصص یہود جلد ۲ صفحہ ۱۴۱

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۴۱)

خلاصۂ بحث

یہ آیت اس سلسلۂ بیان میں دو مرتبہ آئی ہے۔ ایک یہاں، پھر چند ہی آیات کے بعد پارے کے خاتمے پر جہاں یہ سلسلۂ بیان ختم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی وہ خلاصۂ بحث ہے جو مخاطب کے سامنے رکھنا مقصود ہے۔ بتانا یہ ہے کہ تمہارا سارا فخر و اعتماد اپنے باپ دادا پر رہ گیا ہے، تم سمجھتے ہو کہ تمہارے حصے کے اعمال بھی وہ انجام دیے گئے، اب تمھیں صرف ان کی نیکیوں کے پھل کھانے ہیں، تمہارے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں رہ گئی ہے۔ یہ فخر و اعتماد بالکل وہم و خیال پر مبنی ہے۔ انھوں نے اپنے حصے کی ذمہ داریاں انجام دی ہیں اور ان ذمہ داریوں کو انجام دے کر اپنے رب کے پاس پہنچ چکے ہیں، وہ اپنی نیکیوں کا صلہ خود پائیں گے، اس کا کوئی حصہ بھی تمھیں ملنے والا نہیں ہے۔ تمہاری ذمہ داریاں تمہارے اوپر ہیں، اگر تم ان کو انجام دو گے تو ان کا صلہ پاؤ گے، ورنہ ان کی سزا بھگتو گے۔ خدا کے ہاں تم سے تمہارے آباد اجداد کے اعمال سے متعلق پرسش نہیں ہونی ہے بلکہ خود تمہارے اپنے اعمال سے متعلق ہوتی ہے۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۳۵)

اسلام اصل ملتِ ابراہیم ہے

اوپر آیت ۱۱۱ کی وضاحت کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں کہ اسلام کی مخالفت کے جوش میں یہود اور نصاریٰ دونوں متحد ہو کر یہ بات کہتے تھے کہ جو شخص ہدایت اور نجات کا طالب ہو وہ یہودیت اختیار کرے یا نصرانیت، یہ دونوں خدائی دین ہیں، یہ تیسرا دین، جو اسلام کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے کوئی دین نہیں ہے۔

جواب میں فرمایا۔ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا۔ (کہہ دو، بلکہ ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو جو یک سو تھا) ملت کا لفظ یہاں حالتِ نصب میں ہے اس وجہ سے لازماً یہاں کوئی فعل محذوف ماننا پڑے گا۔ عام طور پر لوگ یہاں ماضی کا صیغہ محذوف مانتے ہیں۔ یعنی کہو ہم نے پیروی کی ملتِ ابراہیم کی۔ میں نے یہاں امر کا صیغہ محذوف مانا ہے اور ترجمہ میں اسی کا لحاظ کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہاں یہ جواب جیسا کہ لفظ قُلْ سے واضح ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے دلوایا گیا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بالخصوص اہل کتاب کی گمراہ کن دعوت کے جواب میں دعوت ہی کا خطاب موزوں تھا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کی زبان سے اپنے ایمان و اسلام کا بیان آگے والی آیت میں قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ الآیۃ کے الفاظ سے آ رہا ہے۔ اس وجہ سے اس آیت کو دعوت ہی کے مفہوم میں لینا زیادہ مناسب ہے۔ تیسری یہ کہ عربی زبان میں جب اس طرح منصوب آتا ہے تو اس کا مزاج مخاطب کو کسی بات پر ابھارنے یا اس کو کسی چیز سے ڈرانے کے موقع و محل سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے جس کے لیے امر کا صیغہ زیادہ موزوں ہے۔

حنیف کا مفہوم

حَنِيْفًا۔ حنف سے ہے جس کے اصل معنی مائل ہونے اور جھکنے کے ہیں۔ حنیف اس شخص کو کہتے ہیں جو

ہر طرف سے کٹ کر پوری یکسوئی کے ساتھ خدا کا ہو رہے۔ یہاں یہ لفظ ابراہیمؑ سے حال پڑا ہوا ہے۔ اگرچہ ابراہیمؑ حالت جرّ میں ہے اور مجرور سے حال پڑنے کے معاملہ میں اہل نحو بہت متردد ہیں لیکن مولانا فراہیؒ نے اپنی تفسیر سورۂ فیل میں نہایت قوی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ عربی زبان میں یہ طریقہ معروف ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے حنیف کی صفت قرآن مجید نے بار بار استعمال کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین سب ان کو اپنا روحانی پیشوا مانتے تھے اور ان تینوں ہی گروہوں کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ جس مذہب پر ہیں یہ حضرت ابراہیمؑ ہی کی وراثت ہے۔ قرآن مجید نے مختلف دلائل سے پہلے ان کے اس دعوے کی تردید کی، پھر فرمایا کہ ابراہیمؑ حنیف تھے، وہ خدا کی قائم کردہ صراط مستقیم ——ملت اسلام—— سے ہر مو ادھر ادھر نہیں ہوئے، نہ وہ یہودیت اور نصرانیت کی پگڈنڈیوں کی طرف مڑے، نہ مشرکین کی ضلالتوں میں مبتلا ہوئے۔ بلکہ برابر اسلام کی اسی شاہراہ پر قائم رہے جو خدا نے کھولی تھی اور جو خدا تک پہنچانے والی واحد سیدھی راہ ہے۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۱۳۶)

امتِ مسلمہ کا موقف

یہ یہود و نصاریٰ کی دعوت کہ یہودی یا نصرانی بنو تو ہدایت پاؤ گے، کا مسلمانوں کی طرف سے جواب ہے کہ تم کہہ دو کہ ہم اللہ اور اللہ کی اس ہدایت پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اتری ہے اور جو ابراہیمؑ اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوب کی مختلف شاخوں پر ان کے انبیاء کے واسطہ سے اتری ہے اور اس ہدایت پر بھی ہمارا ایمان ہے جو موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور دوسرے انبیاء کو ان کے رب کی جانب سے ملی۔ ہم ان انبیا کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ ہی کے فرمانبردار ہیں۔

خدا کی شریعت اور اس کے نبیوں اور رسولوں کے باب میں یہ امتِ مسلمہ یا امت وسط کا موقف یا بالفاظ دیگر کلمہ بیان ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امت خدا کی اتاری ہوئی کسی ہدایت کی نہ تو تردید کرتی اور نہ کسی نبی یا رسول کی تکذیب کرتی بلکہ بغیر کسی تفریق و استثنا کے سب پر ایمان رکھتی ہے۔ اس کا موقف یہ ہے کہ خدا کے ان نبیوں اور رسولوں نے اپنی اپنی امتوں کو جو تعلیمیں دی تھیں ان کی امتوں نے ان میں یا تو ملاوٹ کر دی یا ان کے کچھ حصّہ کو فراموش کر دیا، اب اس امت کو جو شریعت ملی ہے وہ خدا کی اصل ہدایت کو اس کی آخری اور مکمل شکل میں پیش کرتی ہے۔

اسباط کا

آیت میں اَسباط کا لفظ سبط کی جمع ہے۔ اس کا لغوی مفہوم بڑھنے اور پھیلنے کا ہے۔ اسی مفہوم کے لحاظ سے ایک باپ کی اولاد اور ان کی مختلف شاخوں کے لیے اس کا استعمال ہوا اور نسلِ یعقوب کی مختلف شاخوں کے لیے تو اس کا استعمال اس قدر معروف ہے کہ معلوم ہوتا ہے انھی کے لیے وضع ہوا ہے۔

"لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ" (ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے) کا مطلب یہ ہے کہ ہم

یہود و نصاریٰ کی طرح یہ نہیں کرتے کہ ان میں سے کسی پر ایمان لائیں اور کسی پر ایمان نہ لائیں۔ اس مطلب کی وضاحت خود قرآن نے دوسری جگہ کر دی ہے۔ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ۔ ١٥٠ ۔ نساء (اور وہ چاہتے ہیں کہ تفریق کریں اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ اس کے بیچ سے کوئی راہ پیدا کریں) اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء میں سے کسی کو ماننا اور کسی کو نہ ماننا سب کے انکار کے ہم معنی ہے اور یہ صرف نبیوں اور نبیوں ہی میں تفریق نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول میں بھی تفریق ہے۔

رسولوں کے درمیان تفریق

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ ۚ فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (١٣٧)

یعنی اگر یہی کلمۂ جامعہ وہ بھی قبول کر لیں جس طرح تم تمام انبیاء اور تمام ہدایتوں پر ایمان لاتے ہو اسی طرح یہ بھی ایمان لائیں تو بلاشبہ وہ راہ یاب ہوں گے۔ راہ یاب ہونے کا راستہ یہودی یا نصرانی ہونا نہیں ہے جیسا کہ یہود و نصاریٰ دعویٰ کرتے ہیں، بلکہ اس کا راستہ وہی ہے جو تم نے اختیار کیا ہے۔ یعنی تمام نبیوں اور تمام رسولوں پر بلا کسی تفریق و تعصب کے ایمان لانا۔ اگر وہ اس چیز سے انکار کرتے ہیں تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ تمہاری مخالفت کے درپے ہیں اور اتحاد و اتفاق کی راہ چھوڑ کر یہ اللہ اور اس کے رسولوں کے خلاف اپنی ایک الگ پارٹی کھڑی رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو انھیں ان کی اختیار کی ہوئی راہ پر چلنے دو، ان کے مقابلہ کے لیے تمہاری طرف سے اللہ کافی ہے۔ آخر میں اپنی صفات میں سے سمیع و علیم کا حوالہ دینے کا مقصد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلانا ہے کہ تمہاری مخالفت میں یہ جو سازشیں اور ریشہ دوانیاں بھی کریں تم ان سے مطلق ہراساں نہ ہو، جو خدا تمہاری طرف سے ان سے لڑنے کھڑا ہوا ہے وہ سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

یہود اور نصاریٰ کے لیے نجات کی راہ

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ (١٣٨)

یہود و نصاریٰ کو مخاطب کر کے دعوت دی گئی ہے کہ اگر اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگنا چاہتے ہو تو یہودیت و نصرانیت کو چھوڑ کر یہ اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ یہ کلمہ جامعہ جس کا اوپر ذکر گزرا، اپنے اندر اللہ کی تمام ہدایتوں اور اس کے تمام نبیوں اور تمام رسولوں کو سمیٹے ہوئے ہے یہی وہ کلمہ ہے جس سے زندگی پر خدا کا اصلی رنگ چڑھتا ہے، پس اگر زندگی کو خدا کے رنگ میں رنگنا ہے تو اس رنگ میں رنگو، اس رنگ سے بڑھ کر کس کا رنگ ہو سکتا ہے؟ اس میں یہود و نصاریٰ کے بپتسمہ کی طرف ایک تعریض بھی ہے اور بغیر کسی فعل کے لفظ صبغہ کا منصوب ہونا ہمارے نزدیک اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں کوئی ایسا صیغہ محذوف مانا جائے جو ابھارنے اور جوش دلانے کے مضمون پر مشتمل ہو۔

یہود و نصاریٰ کو دعوت

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ (۱۳۹)

یہود ونصاریٰ سے اظہار براءت

یعنی اگر اس کلمۂ جامعہ کو نہیں مانتے جو تمام نبیوں اور رسولوں اور اللہ کی اتاری ہوئی تمام ہدایتوں پر ایمان اور اللہ ہی کی بندگی و اطاعت کے اقرار پر مشتمل ہے، بلکہ اس بات پر اڑ گئے ہیں کہ خدا کے بعض نبیوں کو مانیں گے بعض کو نہیں مانیں گے، اس کی بعض ہدایتوں کو قبول کریں گے، بعض کو نہیں قبول کریں گے در آنحالیکہ یہ تمام انبیا و رسل خدا ہی کے بھیجے ہوئے اور یہ ساری ہدایتیں اسی کی نازل کی ہوئی ہیں تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ وہ خود خدا کے بارے میں تم سے جھگڑ رہے ہیں، گویا ان کا خدا کوئی اور ہے اور تمہارا خدا کوئی اور، حالانکہ تمہارا اور ان کا رب ایک ہی ہے۔ اگر انھوں نے فی الواقع بات اس حد تک بڑھا دی ہے کہ اپنا خدا بھی الگ بنا لیا ہے تو اب ان سے کسی خیر کی امید نہ رکھو بلکہ اب یہ بحث و گفتگو بالکل ختم کر کے صاف صاف کہہ دو کہ ہمارے اعمال ہمارے ساتھ ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے ساتھ۔ یعنی اب ہم تمہارے ساتھ کوئی بحث و مناظرہ کرنا بالکل لاحاصل سمجھتے ہیں۔ جب تم خدا کے بارے میں بھی یکسو نہیں ہو تو ہم تم سے کوئی بحث کرنے کے بجائے صرف یہ واضح کرنا کافی سمجھتے ہیں کہ ہم تو خالص اپنے رب ہی کے لیے ہیں

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۱۴۰)

یہ یہود و نصاریٰ سے حضرت ابراہیمؑ اور ان کی ذریت کے باب میں ان کے دعوے کو پھر دہرانے کا مطالبہ بطور اتمام حجت کے کیا ہے۔ یعنی کیا فی الواقع تم یہ سنگین بات کہتے ہو کہ ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور ان کے اخلاف یہودی یا نصرانی تھے، پھر سرزنش کے انداز میں سوال کرایا ہے کہ ان لوگوں کے مذہب و عقیدہ کا حال تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ پھر بانداز حسرت و افسوس فرمایا کہ ان لوگوں سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی کسی شہادت کو چھپائیں، یعنی تورات موجود ہے اس میں ان لوگوں کے مذہب و عقیدہ کی تفصیلات موجود ہیں، اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کے زمانوں میں یہودیت اور نصرانیت کا کہیں نام و نشان بھی پایا نہیں جاتا تھا۔ یہ نام تو تم نے ان کے صدیوں بعد گھڑے ہیں۔ خدا نے ہمیشہ اپنے نبیوں اور رسولوں پر وہی دین اتارا ہے جس کا نام اسلام ہے۔ اس کے بعد نہایت سخت دھمکی کے انداز میں فرمایا کہ یہ اللہ کے دین کے خلاف جو شرارتیں تم کر رہے ہو، خدا ان سے بے خبر نہیں ہے، اس کا انجام تمہارے سامنے آئے گا۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۱۴۱)

بعینہٖ یہی آیت اوپر بھی گزر چکی ہے۔ جس سیاق میں یہ اوپر آئی ہے اسی سیاق میں یہاں بھی آئی ہے۔

وہاں ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو تفسیر آیت ۱۲۴۔

۴۹۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی

مذکورہ بالا مجموعۂ آیات کی آیت ۱۲۹ کی وضاحت اگرچہ بقدرِ ضرورت ہم اوپر کر آئے ہیں لیکن چونکہ اس کا تعلق براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی سے ہے جن کے بارے میں منکرین سنّت نے اس زمانے میں بعض بہت بے ہودہ سوالات اٹھا دیے ہیں اس وجہ سے ہم اس آیت پر یہاں مزید روشنی ڈالیں گے

منکرین سنت کا دعویٰ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلی ذمہ داری بحیثیت پیغمبر کے صرف یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ پر جو وحی نازل فرمائے آپ وہ لوگوں تک پہنچا دیں۔ اس کے بعد بحیثیت رسولؐ کے آپؐ کا فرض ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد نہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر کوئی ذمہ داری ہی ہے اور نہ وحی الٰہی دیا بالفاظِ دیگر قرآن) کے سوا آپ کے کسی قول یا فعل کی کوئی مستقل شرعی اہمیت ہی ہے۔ ہمارے نزدیک منکرین سنت کے اس دعوے کی تردید کے لیے قرآن مجید کی یہ آیت ہی کافی ہے۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی کی جو تفصیل کی گئی ہے، اس میں صرف لوگوں کو قرآن سنا دینے ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ متعدد دوسری چیزوں کا بھی ذکر ہے اور اس آیت سے واضح ہے کہ ان چیزوں کا ذکر بھی آپ کے فرائض نبوت ہی کی حیثیت سے ہوا ہے۔ آیت پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ فرمایا ہے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۱۲۹۔ بقرہ)	اے ہمارے رب، ان میں بھیجو ایک رسول انھی میں سے جو ان کو پڑھ کر سنائے تیری آیتیں اور ان کو تعلیم دے کتاب اور حکمت کی اور ان کا تزکیہ کرے۔ بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔

یہ اس دعا کے الفاظ ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے لیے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے فرمائی تھی۔ اسی دعا کے مطابق جب آنحضرتؐ کی بعثت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اہل عرب پر اپنے اس احسانِ عظیم کا اظہار یوں فرمایا۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (۲۔ جمعہ)	وہی خدا ہے جس نے بھیجا امیوں (بنی اسماعیل) میں ایک رسول انھی میں سے جو ان کو پڑھ کر سناتا ہے اس کی آیتیں اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ بے شک یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

ان دونوں آیتوں پر غور کیجیے تو یہ حقیقت واضح ہو گی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جن صفات کے

پیغمبر کے لیے دعا کی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعینہٖ انھیں صفات کے ساتھ مبعوث ہوئے اور آپ نے امیوں کے اندر عملاً وہ سارے کام انجام دیے بھی جن کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے دعا فرمائی تھی۔

ان دونوں ہی مقامات میں جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض کا تعلق ہے ان کے بیان میں کوئی اختلاف نہیں۔ اگر کوئی اختلاف ہے تو صرف یہ کہ اوپر والی آیت میں تزکیہ کا ذکر سب کے آخر میں ہے اور دوسری آیت میں تعلیم کتاب و حکمت سے پہلے لیکن تلاوتِ آیات کے بعد۔ یہ فرق کوئی خاص اہمیت رکھنے والا فرق نہیں۔ تزکیہ کے مقدم و مؤخر ہونے کی وجہ ایک دوسرے مقام میں ہم واضح کر چکے ہیں[۱] کہ تزکیہ تمام دین و شریعت کی غایت اور بعثتِ انبیا کا اصل مقصود ہے اور جو چیز کسی کام میں غایت و مقصود کی حیثیت رکھتی ہے وہ عمل میں اگرچہ مؤخر ہوتی ہے لیکن ارادہ میں مقدم ہوتی ہے اس وجہ سے اصل اسکیم میں اس کا ذکر مقدم بھی ہو سکتا ہے اور مؤخر بھی۔ چنانچہ اسی اعتبار سے تزکیہ کا ذکر ایک آیت میں مقدم ہوا ہے دوسری میں مؤخر۔ اس ترتیب کے فرق کے علاوہ دوسری ساری باتیں دونوں آیتوں میں بالکل مشترک ہیں اور ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مندرجہ ذیل فرائض بتائے گئے ہیں۔

نبی صلعم کے فرائض

۱۔ تلاوتِ آیات

۲۔ تعلیم کتاب و حکمت

۳۔ تزکیہ

تلاوتِ آیات

ان میں سے جہاں تک پہلی چیز — تلاوتِ آیات — کا تعلق ہے، ہم بلا کسی بحث و نزاع کے تسلیم کیے لیتے ہیں کہ اس سے مراد لوگوں کو قرآن مجید سنانا ہی ہے۔ دین و دانش دونوں ہی سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ خدا کے ایک رسول کا اولین فریضہ یہی ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کے بندوں تک اس کی وحی کو پہنچائے لیکن اس تلاوت کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ اس طرح نہیں ہوئی ہے کہ لوگوں کو پوری کتاب بیک دفعہ سنا دی گئی ہو بلکہ یہ ۲۳ سال کی وسیع و طویل مدت میں تھوڑی تھوڑی کر کے اتاری گئی اور اسی تدریج کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو سبقاً سبقاً اس کی تعلیم دی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ کتاب کوئی سہل اور سپاٹ کتاب نہیں ہے بلکہ یہ نہایت گہرے علوم و معارف اور اعلیٰ اسرار و حقائق کی کتاب ہے۔ اس وجہ سے اس کے لیے یہ ضروری ہوا کہ یہ سبق سبق کر کے پڑھائی جائے تاکہ لوگوں کی اس کے خزانوں تک رسائی ہو سکے۔ اس حقیقت کو قرآن نے یوں واضح کیا ہے وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ (۱۰۶-۱۷) اور ہم نے اس قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا تاکہ تو لوگوں کو اس کو وقفہ وقفہ کے ساتھ سنائے۔

---

[۱] اس نکتہ کی وضاحت کے لیے ہماری کتاب "تزکیہ نفس" کی فصل اول ملاحظہ ہو۔

تعلیم کتاب و حکمت

قرآن حکیم کی مذکورہ بالا خصوصیت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس کو ایک قاری کی طرح صرف سنا دینے ہی پر اکتفا نہ فرمائیں بلکہ ایک معلم کی طرح پوری دلسوزی اور پوری شفقت کے ساتھ لوگوں کو اس کی تعلیم بھی دیں۔ چنانچہ اسی بنا پر تلاوت کے ساتھ ساتھ آپ کا دوسرا فرض تعلیم کتاب بتایا گیا۔ یہ تعلیم کتاب کا فریضہ آپ کے فرائض نبوت ہی کا ایک جزو اور آپ کا معلم ہونا آپ کے منصب رسالت ہی کا ایک پہلو ہے۔ اس وجہ سے اپنی اس حیثیت میں آپ نے جو کچھ لوگوں کو سکھایا اور بتایا اس کو آپ کے فرائض نبوت سے نہ تو خارج کیا جا سکتا اور نہ اس کا درجہ اصل کتاب کے مقابل میں گرایا ہی جا سکتا۔

اب غور فرمائیے کہ اس تعلیم کے تقاضے کیا کیا ہو سکتے ہیں؟

اس کا ایک بالکل ابتدائی تقاضا تو یہ ہے کہ قرآن میں جو شرعی اصطلاحات مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، صیام، طواف، عمرہ، نکاح، طلاق وغیرہ استعمال ہوئی ہیں لیکن ان کی عملی شکلیں واضح نہیں کی گئی ہیں ان کو آپ اچھی طرح لوگوں پر واضح کر دیں تاکہ لوگ عملی زندگی میں ان کو اختیار کر سکیں اور ان کے مختلف اجزاء کا دین میں جو مقام ہے اس کو متعین کر سکیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ قرآن میں فکر و عمل کی تصحیح کے جو اصول دیے گئے ہیں ان کے لوازم و تضمنات کے ضروری گوشے واضح کر دیے جائیں تاکہ ان ابواب میں مزید رہنمائی حاصل کرنے کے لیے وہ روشنی کے میناروں کا کام دیں۔

اسی طرح ایک چیز یہ بھی ہے کہ قرآن میں جو احکام شریعت دیے گئے ہیں ان کی حیثیت صرف اصولی احکام کی ہے۔ ان میں سے ہر باب کے تحت بے شمار صورتیں ایسی آتی ہیں جن میں احکام کا تعین معلم کی رہنمائی اور اجتہاد پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اجتہاد کے لیے امت کو بہترین رہنمائی ان مثالوں ہی سے مل سکتی تھی جو اس کتاب کے معصوم معلم نے اپنے اجتہاد سے قائم کیں۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ قرآن اجتماعی زندگی کا ایک نظام بھی پیش کرتا ہے لیکن اس کے صرف چاروں گوشے متعین کر دینے والے اصول دے کر اس کی جزئیات و تفصیلات اور اس کے عملی ڈھانچے کے معاملہ کو معلم کی ذمہ داری پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس چیز کو بھی لوگوں نے حضورؐ ہی کی تعلیم سے سیکھا۔

ان کے علاوہ ایک اہم چیز یہ بھی ہے کہ زیر بحث آیت میں صرف تعلیم کتاب ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ تعلیم حکمت کا بھی ذکر ہے۔ تعلیم حکمت تعلیم شریعت سے بہت وسیع چیز ہے۔ اس سے مراد، جیسا کہ اس لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں، وہ دانش و بینش اور وہ بصیرت و معرفت ہے جو زندگی کے ان بعید گوشوں میں بھی انسان کی رہنمائی کرتی ہے جہاں رہنمائی کرنے والی اس کے سامنے کوئی اور روشنی نہیں ہوتی۔

اب غور کیجیے کہ یہ ساری باتیں تعلیم کے تقاضوں میں سے ہیں یا نہیں؟ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

ان ساری چیزوں کی تعلیم کے لیے بحیثیت ایک خدائی معلم کے مامور تھے یا نہیں؟ اگر ان سوالوں کا جواب اثبات میں ہے اور ظاہر ہے کہ ان کا جواب اثبات ہی کی صورت میں ہو سکتا ہے تو غور کیجیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس حیثیت میں جو کچھ کہا اور کیا ہے اس کو آپ کے فرائض نبوت کے دائرے سے الگ کس طرح کیا جا سکتا ہے اور اس کی اہمیت کو گھٹایا کس طرح جا سکتا ہے؟ اور پھر اس بات پر غور کیجیے کہ احادیث میں ان چیزوں کے سوا اور کیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیثیت معلم کتاب و حکمت ہونے کے بتائی ہیں یا ان پر عمل کر کے دکھایا ہے؟

تزکیہ

اسی طرح اب تزکیہ پر غور کیجیے۔ تزکیہ کا عمل ظاہر ہے کہ تعلیم سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور وسیع الاطراف ہے۔ اوپر ہم واضح کر آئے ہیں کہ اس لفظ میں پاک صاف کرنے اور نشوونما دینے، دونوں کا مفہوم شامل ہے۔ یہ بیک وقت علمی بھی ہے اور عملی بھی، ظاہری بھی ہے باطنی بھی، مادی اور جسمانی بھی ہے اور عقلی و روحانی بھی، نیز یہ انفرادی بھی ہے اور سماجی و اجتماعی بھی۔ مختصراً چند بنیادی تقاضے اس کے بھی سامنے رکھ لیجیے۔

اس کا ایک ضروری تقاضا تو یہ ہے کہ لوگوں کے اذہان، اعمال اور اخلاق پر خوردبینی نگاہ ڈال کر ان جراثیم سے ان کو پاک کیا جائے جو روحانی اور اخلاقی بیماریوں کے سبب بنتے ہیں اور ساتھ ہی ان کے اندر ان نیکیوں کی تخم ریزی کی جائے جو انسان کے ظاہر و باطن کو سنوارتی اور اس کے عادات و خصائل کو مہذب بناتی ہیں۔

اس کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کی اس طرح تربیت کی جائے کہ ہر خوبی ان کے اندر جڑ پکڑ جائے اور ہر برائی کے خلاف طبیعتوں میں نفرت بیٹھ جائے۔

اس کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ اس تعلیم و تربیت سے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے جو تزکیہ نفوس کے لیے ایک وسیع تربیت گاہ کا کام دینے لگ جائے، جو شخص بھی اس میں اٹھے اسی ماحول کے اثرات لیے ہوئے اٹھے اور جو شخص بھی اس کے اندر داخل ہو جائے اس پر اسی کا رنگ چڑھ جائے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ خیال بڑا مغالطہ انگیز ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضۂ منصبی بحیثیت رسول کے صرف یہ تھا کہ آپ لوگوں کو قرآن پہنچا دیں۔ قرآن کا پہنچا دینا آپ کے فرائض منصبی کا صرف ایک جزو تھا۔ اس کے علاوہ آپ کی یہ ذمہ داری بھی تھی کہ آپ ایک معلم کی طرح لوگوں کو اس قرآن کی تعلیم دیں، اس کے مضمرات و تضمنات، اس کے اجمالات و اشارات اور اس کے اسرار و حقائق لوگوں پر واضح کر دیں، اس کے عجائب حکمت کے خزانوں تک لوگوں کی رہبری فرمائیں۔ اسی طرح آپ کی یہ ذمہ داری بھی تھی کہ آپ قرآنی حکمت کی روشنی میں افراد اور معاشرہ کی تربیت کے اصول و فروع بھی متعین فرمائیں اور ان اصولوں کے مطابق لوگوں کا تزکیہ بھی کریں۔

یہ سارے کام آپ کے فرائضِ نبوت میں شامل تھے۔ اس وجہ سے ان مقاصد کے تحت آپ نے جو کچھ بتایا یا جو کچھ کیا اس سب کو امت نے اسی طرح واجب التعمیل سمجھا جس طرح قرآن کو سمجھا اور اسی اہمیت کے ساتھ اس کی حفاظت اور اس کے نقل و روایت کا اہتمام کیا۔ اس کے کسی جزو کے متعلق یہ سوال تو اٹھایا جا سکتا ہے کہ اس کا انتساب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پوری صحت کے ساتھ ثابت ہے یا نہیں لیکن اس کو دین و شریعت سمجھنے سے انکار کرنا خود قرآن مجید کے انکار کے ہم معنی ہے۔

۵۰۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۴۲-۱۶۲

منصبِ امامت سے یہود کی معزولی کے اسباب و وجوہ کی تفصیل اس مجموعہ آیات پر ختم ہو رہی ہے۔ اب گویا ان کو معزول کر کے ایک نئی امت کے قیام کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ یہ امت امتِ وسط ہے یعنی یہ اس صراطِ مستقیم پر قائم ہے جو دینِ حق کی اصل خدائی شاہراہ ہے۔ اس کی ملت، ملتِ ابراہیم اور اس کا قبلہ، قبلۂ ابراہیمی بیت اللہ الحرام ہے۔ اس کا فریضۂ منصبی یہ ہے کہ جس طرح پیغمبرؐ نے اس کے سامنے اللہ کے اصلی دین کی گواہی دی ہے اسی طرح یہ خلقِ خدا کے سامنے اللہ کے دین کی شہادت دینے والی ہو گی۔

اِن آیات کے زمانۂ نزول تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان نمازوں میں بیت المقدس کی طرف رخ کرتے تھے۔ اب ملتِ ابراہیمی کے تعلق سے ضروری ہوا کہ اس امت کا قبلہ مسجدِ حرام ہو۔ اس وجہ سے تحویلِ قبلہ کا حکم ہوا۔ پھر اس ردِ عمل کی تفصیلات بیان ہوئیں جو اس واقعہ کا یہود اور مسلمانوں کے بعض گروہوں پر ہوا اور ساتھ ہی تحویلِ قبلہ کی حکمتیں اور قبلہ سے متعلق وہ ضروری ہدایات بیان ہوئیں جو مسلمانوں کو قبلہ کے باب میں جادۂ مستقیم پر استوار رکھنے کے لیے ضروری تھیں اور جن کا اہتمام نہ رکھنے کی وجہ سے یہود اور نصاریٰ اصل قبلہ سے منحرف ہو گئے۔

پھر ایک مستقل امت کی حیثیت سے مسلمانوں سے یہ عہد لیا گیا کہ تحویلِ قبلہ کے بعد اب تم یہود و نصاریٰ سے الگ ایک مستقل امت کی حیثیت سے ممتاز ہو گئے۔ جس طرح تمہارا رسول ایک الگ رسول ہے جو ان تمام صفات کا مظہر ہے جن کے لیے ابراہیمؑ نے دعا کی تھی، اسی طرح تمہارا قبلہ ابراہیمی قبلہ ہے۔ اب تم ان یہود سے ذرا بھی نہ ڈرو، صرف اللہ ہی سے ڈرو تاکہ تمہیں اللہ کے دینِ کامل کی نعمت نصیب ہو اور تمہارے لیے شریعتِ الٰہی کی راہیں کھلیں۔ تم مجھے یاد رکھو گے تو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ میری شکر گزاری کرتے رہنا، ناشکری نہ کرنا۔

اس کے بعد ان متوقع خطرات کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ایک مستقل امت کی حیثیت سے نمایاں ہونے کے بعد مخالفین و معاندین کی طرف سے پیش آ سکتے ہیں اور ان خطرات کے مقابلہ کے لیے مسلمانوں کو جن تیاریوں اور جن ایمانی و اخلاقی اسلحہ سے مسلح ہونے کی ضرورت ہے، ان کی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔

آخر میں خانہ کعبہ کے تعلق سے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ خانہ کعبہ کی طرح صفا اور مروہ بھی اللہ کے شعائر میں داخل ہیں، اس لیے کہ یہی مروہ ہے جو اصل قربان گاہ ہے، لیکن یہود نے تحریف کے ذریعہ سے ان نشاناتِ راہ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی تاکہ حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کا تعلق اس گھر سے بالکل کاٹ دیں۔ یہود اپنی اس شرارت کے سبب سے اس بات کے مستحق ہیں کہ ان پر اللہ کی اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت ہو۔

اس تمہید کے بعد اب آیات تلاوت فرمایئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۱۴۲-۱۶۲

سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِىْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ

مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۴۵ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ (وقف لازم)
الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۭ وَاِنَّ فَرِيْقًا
مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۱۴۶ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ (وقف منزل)
فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝۱۴۷ ع وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا
الْخَيْرٰتِ ۭ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى (وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم)
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۴۸ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ
شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۴۹ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ
شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۤ اِلَّا الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۤ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۤ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ
وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۱۵۰ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا
عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ
مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝۱۵۱ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ (معانقة)
وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝۱۵۲ ع يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ
الصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۵۳ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝۱۵۴
وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ

وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ
مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ
صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ اِنَّ
الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ
شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ
وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ
يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا
وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ
اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا
يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

ترجمہ آیات ۱۴۲-۱۶۲

اب جو بے وقوف لوگ ہیں وہ کہیں گے کہ ان لوگوں کو اُس قبلہ سے جس پر یہ پہلے
تھے کس چیز نے رُوگردان کر دیا۔ کہہ دو مشرق اور مغرب اللہ ہی کے ہیں، وہ جس کو چاہتا ہے
سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے اور اسی طرح ہم نے تمھیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر
گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔ اور جس قبلہ پر تم تھے ہم نے اس کو
صرف اس لیے ٹھہرایا تھا کہ ہم الگ کر دیں ان لوگوں کو جو رسول کی پیروی کرنے والے ہیں،

ان لوگوں سے جو پیٹھ پیچھے پھر جانے والے ہیں۔ بے شک یہ بات بھاری ہے مگر ان لوگوں پر جن کو اللہ ہدایت نصیب کرے۔ اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ وہ تمہارے ایمان کو ضائع کرنا چاہے، اللہ تو لوگوں کے ساتھ بڑا مہربان اور رحیم ہے۔ ۱۴۲-۱۴۳

ہم آسمان کی طرف تمہارے رُخ کی گردش دیکھتے رہے ہیں، سو ہم نے فیصلہ کر لیا کہ ہم تمہیں اس قبلہ کی طرف پھیر دیں جس کو تم پسند کرتے ہو۔ تو تم اپنا رخ مسجد حرام کی طرف کرو۔ اور جہاں کہیں بھی تم ہو تو اپنے رخ اسی کی طرف کرو۔ جن لوگوں کو کتاب ملی وہ جانتے ہیں کہ یہی ان کے رب کی جانب سے حق ہے اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ اور اگر تم اہل کتاب کے سامنے ہر قسم کی نشانیاں بھی پیش کر دو تو بھی یہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے اور نہ تم ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے بن سکتے اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کی پیروی کرنے والے بن سکتے۔ اور اگر تم اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے ان کی خواہشوں کی پیروی کرو گے تو بلاشبہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ جن کو ہم نے کتاب عنایت کی ہے وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ البتہ ان میں ایک گروہ ہے جو جانتے بوجھتے حق کو چھپاتا ہے۔ یہی حق ہے تمہارے رب کی جانب سے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ بن جانا۔ ۱۴۴-۱۴۷

ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے وہ اسی کی طرف رخ کرنے والا ہے تو تم نیکیوں کی راہ میں سبقت کرو۔ جہاں کہیں بھی تم ہو گے، اللہ تم سب کو جمع کرے گا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱۴۸

اور جہاں کہیں سے بھی تم نکلو تو اپنا رخ مسجد حرام ہی کی طرف کرو۔ بے شک یہی

حق ہے تمھارے رب کی جانب سے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ ۱۴۹

اور جہاں کہیں سے بھی نکلو تو اپنا رخ مسجد حرام ہی کی طرف کرو۔ اور جہاں کہیں بھی تم ہو تو اپنے رخ اسی کی جانب کرو تاکہ لوگوں کے لیے تمھارے خلاف کوئی حجت باقی نہ رہے، مگر جو ان میں سے ظالم ہیں تو ان سے نہ ڈرو، مجھی سے ڈرو۔ اور تاکہ میں اپنی نعمت تم پر تمام کروں اور تاکہ تم راہ یاب ہو۔ چنانچہ ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا تم ہی میں سے جو تمھیں ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا اور تمھیں پاک کرتا ہے اور تمھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمھیں ان چیزوں کی تعلیم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔ تو تم مجھے یاد رکھو، میں تمھیں یاد رکھوں گا۔ میری شکر گزاری کرتے رہنا، میری ناشکری نہ کرنا۔ ۱۵۰-۱۵۲

اے ایمان والو، ثابت قدمی اور نماز سے مدد چاہو۔ بے شک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم محسوس نہیں کرتے۔ بے شک ہم تمھارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف، بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے اور ان ثابت قدموں کو خوش خبری سنا دو جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی عنایتیں ہیں اور رحمت، اور یہی لوگ راہ یاب ہونے والے ہیں۔ ۱۵۲-۱۵۷

بے شک صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں تو جو بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں کہ ان کا طواف کرے اور جس نے کوئی نیکی خوش دلی کے ساتھ کی تو اللہ قبول کرنے والا اور جاننے والا ہے۔ بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں ہماری اُتاری ہوئی

کھلی کھلی نشانیوں اور ہماری ہدایت کو، بعد اس کے کہ ہم نے وہ کتاب میں کھول کر لوگوں کے لیے بیان کردی تھیں تو وہی لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور جن پر لعنت کرنے والے لعنت کریں گے۔ ۱۵۸-۱۵۹

البتہ جن لوگوں نے توبہ کرلی اور اصلاح کرلی اور واضح طور پر بیان کر دیا تو ان کی توبہ میں قبول کروں گا۔ میں بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اسی کفر کی حالت میں مرگئے ان پر اللہ کی، فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔ وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت ہی ملے گی۔ ۱۶۰-۱۶۲

۱۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾

یہود کو بے وقوف قرار دینے کی وجہ

سُفَہَاء سفیہ کی جمع ہے جس کے معنی نادان اور بے وقوف کے ہیں۔ یہاں اس سے اشارہ یہود کی طرف ہے۔ یہود کے بے وقوف قرار دینے کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم آیت وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ - بقرہ ۱۳۰ (اور ابراہیم کی ملت سے اس کے سوا کون بے رغبت ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کرے) میں اشارہ کر چکے ہیں۔ یہود ایک طرف تو ملت ابراہیم کے پیرو ہونے کے مدعی تھے دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تعلیم و دعوت کے سخت دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے حالانکہ آپؐ اصل ملت ابراہیمی کے داعی بن کر تشریف لائے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی الٹی حرکت نادان اور بے وقوف لوگ ہی کر سکتے تھے، اس وجہ سے قرآن نے ان کے لیے سفہا کا لفظ استعمال کیا۔

تحویل قبلہ کے متوقع ردِ عمل کی طرف پہلے سے اشارہ

یہ تمہید ہے تحویل قبلہ کے اس حکم کی جس کا ذکر آگے دو آیتوں کے بعد آرہا ہے۔ اس تمہید میں اشارہ ہے اس ردِ عمل کی طرف جو اس حکم کا یہود اور منافقین پر ہوگا۔ اصل حکم سے پہلے اس کے ردِ عمل کے بیان کرنے کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ قبلہ کی تبدیلی کا حکم کوئی معمولی حکم نہیں تھا، اسلام کے مخالفوں اور اس کے حامیوں دونوں ہی کے اندر یہ خاصی ہلچل پیدا کر دینے والا حکم تھا۔ اس وجہ سے ضروری ہوا کہ اس حکم سے پہلے اس

کے متوقع ردِ عمل کے لیے ذہنوں کو تیار کر دیا جائے۔ دوسری وجہ اس کی یہ ہے کہ اس سے اوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ذریت کی جو سرگزشت بیان ہوئی ہے اس سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر ہر قاری کے سامنے آچکی تھی کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ اور ان کی اولاد کا مذہب اسلام تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ میں عبادتِ الٰہی کے لیے جو مرکز تعمیر کیا وہ ان کی ساری ہی ذریت کا مرکز اور قبلہ تھا، یہاں تک کہ بیت المقدس بھی جب تعمیر ہوا تو اس کی تعمیر بھی اس طرح ہوئی کہ بنی اسرائیل کی قربانیوں کا رُخ خانہ کعبہ کی طرف ہو۔ یہ تمام باتیں بالکل غیر مبہم طور پر اس بات کو ظاہر کر رہی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا ایک بالکل عارضی معاملہ تھا اور اب وقت آگیا ہے کہ آپ کو بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کا حکم دے دیا جائے۔ اس وجہ سے یہ تمہید ایک ایسے واقعہ کی تمہید تھی جس کے واقع ہونے کا انتظار یہود و نصاریٰ کو بھی تھا اور مسلمانوں کو بھی۔

تحویلِ قبلہ پر یہود کا اعتراض

مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا (ان کو ان کے اس قبلہ سے کس چیز نے ہٹا دیا جس پر وہ اب تک تھے) یہ تحویلِ قبلہ کے حکم پر اہلِ کتاب کے ردِ عمل کا بیان ہے کہ اب تک یہ لوگ مسلمانوں پر جو اعتراضات کرتے رہے ہیں ان کا بیان اوپر ہو چکا ہے۔ اب جب قبلہ بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کو قرار دیا جائے گا تو یہ اس پر بھی ہنگامہ اٹھائیں گے کہ مسلمانوں نے تمام انبیاء کے قبلہ — بیت المقدس — کو جس کی طرف رُخ کر کے وہ اب تک نماز پڑھتے رہے تھے، چھوڑ کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد یہ الگ کیوں بنائی ہے؟

اعتراض کا جواب

قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (کہہ دو، مشرق اور مغرب دونوں اللہ ہی کے ہیں، وہ جس کو چاہتا ہے سیدھا رستہ دکھا دیتا ہے) یہ یہود و نصاریٰ کے مذکورہ بالا اعتراض کا جواب ہے کہ تمہیں اب قبلہ سے کیا واسطہ؟ تم تو اصل قبلہ کے بجائے مشرق و مغرب کے چکر میں پھنس گئے ہو، نصاریٰ مشرق کو اپنا قبلہ قرار دے بیٹھے ہیں اور یہود مغرب کو، حالانکہ سمتوں میں سے کسی سمت کو بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی خصوصیت کی کوئی وجہ نہیں، اللہ تعالیٰ تو ہر سمت میں ہے، مشرق و مغرب، شمال و جنوب سب اسی کی فرمانروائی میں ہیں۔ اس کے ساتھ اگر خصوصیت ہو سکتی ہے تو کسی ایسے گھر ہی کو ہو سکتی ہے جس کو وہ مخصوص فرمائے اور قبلہ قرار دے۔ یہ خصوصیت رکھنے والا گھر ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کا تعمیر کردہ گھر مکہ کا بیت اللہ ہے۔ وہی تمام اولادِ ابراہیمؑ کا قبلہ قرار پایا تھا اور اسی کو قبلہ قرار دے کر بیت المقدس کی بھی تعمیر ہوئی تھی۔ اس حقیقت کے نشانات و آثار تورات میں موجود تھے لیکن تم نے تعصب کی وجہ سے یہ نشانات مٹا دیے تھے۔ لیکن تمہاری ان مخالفانہ کوششوں کے علی الرغم اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کے ذریعہ سے جن کو چاہا سیدھا راستہ دکھا دیا اور اب وہ تمہارے پیدا کردہ پیچ و خم سے

نکل کر ایک صراطِ مستقیم پر چل کھڑے ہوئے ہیں۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ كَذٰلِكَ کا اشارہ اوپر والے معاملہ کی طرف ہے یعنی جس طرح ہم نے قبلے کے معاملہ میں یہود و نصاریٰ کے پیدا کردہ پیچ وخم اور مشرق و مغرب کے چکر سے تمھیں نکال کر صراطِ مستقیم کی طرف تمھاری رہنمائی کی، اسی طرح ہم نے تم کو یہودیت اور نصرانیت کی پگڈنڈیوں سے بچا کر دین کی بیچ شاہراہ پر قائم رہنے والی امت بنایا تاکہ رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دیں اور تم خلقِ خدا پر اللہ کے دین کی گواہی دو۔

امتِ وسط

وَسَط لفظ ولد کی طرح مذکر اور مؤنث، واحد اور جمع سب کے لیے آتا ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ شے جو دو طرفوں کے درمیان بالکل وسط میں ہو۔ یہیں سے اس کے اندر بہتر ہونے کا مفہوم پیدا ہو گیا اس لیے کہ جو شے دو کناروں کے درمیان ہوگی وہ نقطۂ توسط و اعتدال پر ہوگی اور یہ اس کے بہتر ہونے کی ایک فطری دلیل ہے۔ امتِ مسلمہ کو امتِ وسط کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ امت ٹھیک دین کی اس بیچ شاہراہ پر قائم ہے جو اللہ تعالیٰ نے خلق کی رہنمائی کے لیے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے کھولی ہے اور جو ابتدا سے ہدایت کی اصلی شاہراہ ہے۔ یہود و نصاریٰ اللہ کے نبیوں میں تفریق کر کے اس شاہراہ سے ہٹ گئے اور انھوں نے یہودیت و نصرانیت کی پگ ڈنڈیاں نکال لیں، اسی طرح وہ اصل قبلہ سے منحرف ہو کر مشرق و مغرب کے جھگڑوں میں پڑ گئے۔ لیکن یہ امت ان کج پیچ کی راہوں میں بھٹکنے کے بجائے دین کی اصلی راہ پر قائم ہے۔ اس کا کلمہ تفریق کے بجائے وحدت کا کلمہ ہے جس کا حوالہ اوپر ان الفاظ میں گزر چکا ہے۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا	تم کہہ دو کہ ہم تو اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز
وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ	پر جو ہم پر اتاری گئی اور اس چیز پر جو ابراہیم،
وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ	اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد پر اتاری
وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ	گئی اور اس چیز پر ایمان لائے جو موسیٰ اور عیسیٰ اور
النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ	دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی جانب سے ملی۔
اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ	ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور
(۱۳۶ - بقرہ)	ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

۱؎ یہاں ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے آیات ۱۱۵ اور ۱۲۰ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

اسی طرح اس امت نے قبلہ کے معاملہ میں مشرق و مغرب کے جھگڑے میں پڑنے کے بجائے اس قبلہ ابراہیمی کی پیروی کی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد مبارک سے برابر تمام نبیوں اور رسولوں کا قبلہ رہا، چنانچہ بیت المقدس کی تعمیر بھی، جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے اسی کو قبلہ قرار دے کر ہوئی لیکن یہود نے بربنائے تعصب اس حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی۔

دین کے معاملہ میں امت مسلمہ کی یہی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے قرآن میں دوسری جگہ اس امت کو خیرامت (بہترین امت) کہا گیا ہے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ جو چیز ٹھیک نقطۂ اعتدال و توسط پر ہوگی وہ لازماً بہترین بھی ہوگی۔ یہ امت چونکہ امتِ وسط ہے اس وجہ سے یہ خیرامت بھی ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہود کا دین بہت سخت اور نصاریٰ کا دین بہت نرم ہے۔ اسلام ان دونوں کے درمیان ایک معتدل دین ہے اس وجہ سے اس دینِ معتدل کی حامل امت کو امتِ وَسَط قرار دیا گیا۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ جہاں تک اصل دین کا تعلق ہے یہود و نصاریٰ دونوں کا دین ایک ہی ہے۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اپنی امت پر تورات کی پابندی اسی طرح واجب قرار دی تھی جس طرح اس کی پابندی یہود پر واجب تھی۔ اگر انھوں نے اس سے الگ کوئی تعلیم دی ہے تو اس کی نوعیت تورات سے جدا کسی مستقل تعلیم کی نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت صرف حکمتِ دین اور روحِ دین کی ہے۔ یہود اپنی دنیا پرستی کی وجہ سے دین کی اصل حقیقتوں سے ہٹ کر صرف رسوم و قیود کے غلام اور الفاظ و کلمات کے پرستار بن کے رہ گئے تھے، حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کو حکمتِ دین سے آشنا کیا۔ انجیل تورات سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ تورات ہی کے رموز و حقائق کی طرف ایک حکیمانہ توجہ دلاتی ہے۔

امتِ وسط کا فریضۂ منصبی

لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (تاکہ تم لوگوں پر اللہ کے دین کے گواہ بنو اور رسول تمھارے اوپر اللہ کے دین کا گواہ بنے) یہ امتِ وسط کے فریضۂ منصبی اور اس کے قیام کی ضرورت کا بیان ہے۔ اوپر کی تفصیلات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو رہنمائی کے منصب پر مامور کیا تھا انھوں نے خدا کے میثاق کو توڑ دیا، اس کی شریعت میں تبدیلیاں کر دیں، اس کی صراطِ مستقیم گم کر دی، اس کے مقرر کیے ہوئے قبلہ سے منحرف ہو گئے اور جن شہادتوں کے وہ امین بنائے گئے تھے ان کو انھوں نے چھپایا۔ ایسے حالات میں عالمِ انسانیت کی سب سے بڑی ضرورت اگر کوئی ہو سکتی تھی تو یہی ہو سکتی تھی کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی امت برپا کرے جو خدا کی سیدھی راہ پر قائم ہو، جو اللہ کے رسول کے ذریعہ سے اصل دین کی حامل بنے اور پھر رہتی دنیا تک لوگوں کے سامنے اس دین کی گواہی دے۔

"رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو" سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ شہادت علی الناس

کا جو فرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بحیثیت رسول کے تھا آپ کے بعد آپ کی امت کی طرف منتقل ہوا اور اب یہ اس امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر دور، ہر ملک اور ہر زبان میں لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دے، اگر وہ اس فرض میں کوتاہی کرے گی تو اس دنیا کی گمراہیوں کے نتائج بھگتنے میں دوسروں کے ساتھ وہ بھی برابر کی شریک ہوگی۔

ہمارے اربابِ تاویل نے عام طور پر اس شہادت کو آخرت سے متعلق مانا ہے کہ یہ امت گمراہوں کے خلاف انبیا کی تائید میں آخرت میں شہادت دے گی کہ ان گمراہوں کو اللہ کا دین پہنچ چکا تھا، اس کے باوجود انھوں نے گمراہی کی یہ روش اختیار کی۔ لیکن ہمارے نزدیک اس تخصیص و تحدید کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس امت کو شہداء اللہ ہونے کا یہ مرتبہ آخرت میں بھی حاصل ہوگا۔ لیکن آخرت میں یہ مرتبہ اسی وجہ سے حاصل ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اس کو اس منصب پر سرفراز فرمایا ہے۔ جو امت اس دنیا میں دینِ حق کی گواہ ہے، ظاہر ہے کہ وہی آخرت میں بھی اس پوزیشن میں ہوگی کہ گواہی دے کہ لوگوں کو اللہ کا دین ٹھیک ٹھیک پہنچایا نہیں۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ

جَعَلَ کا مفہوم

جَعَلَ کا لفظ وسیع معنوں میں آتا ہے۔ اس کے ایک معنی جائز ٹھہرانے اور مشروع قرار دینے کے بھی ہیں، مثلاً مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ وَلَا وَصِيلَةٍ ۱۰۳- مائدہ (اور خدا نے بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ کو مشروع نہیں کیا)۔

عَلِمَ یَعْلَمُ کا مفہوم

عَلِمَ يَعْلَمُ کے معنی جس طرح جان لینے اور معین کر لینے کے ہیں اسی طرح اس کے معنی ممیز کر دینے، چھانٹ کر الگ کر دینے اور ظاہر کر دینے کے بھی ہیں۔ مثلاً وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّىٰ نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِينَ ۳۱- محمد (اور ہم تمھیں جانچیں گے یہاں تک کہ ظاہر کر دیں تمھارے اندر سے ان لوگوں کو جو جہاد کرنے والے اور ثابت قدم رہنے والے ہیں) أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ ۱۴۳- آل عمران (کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تمھارے اندر سے ان لوگوں کو ظاہر نہیں کیا جنھوں نے جہاد کیا)۔

بیت المقدس کو عارضی طور پر قبلہ قرار دینے کی حکمت

مطلب یہ ہے کہ یہ جو تمھیں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کی اجازت دے دی گئی تھی تو اس لیے نہیں کہ یہی تمھارا مستقل قبلہ ہے بلکہ یہ اجازت ایک عارضی اور وقتی اجازت تھی اور مقصود اس اجازت سے یہ تھا کہ پھر اس قبلہ کی تبدیلی تمھارے لیے امتحان کی ایک کسوٹی بنے اور اس کے ذریعہ سے یہ ظاہر کر دیا جائے کہ تمھارے اندر کتنے آدمی ایسے ہیں جو فی الواقع رسول کے پیرو ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو رسول سے زیادہ اپنی پچھلی روایات کے پرستار ہیں اور وہ پھر مڑ کر اپنے قدیم دین ہی کی طرف چلے جاتے ہیں۔

یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب نماز کا حکم ہوا تو آپ نے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا۔ شروع شروع میں حضور کا طریقہ یہ تھا کہ جن معاملات میں آپ کے سامنے وحی الٰہی کی کوئی واضح رہنمائی نہ ہوتی ان میں آپ پچھلے انبیاء کے طریقہ پر عمل کرتے چنانچہ قبلہ کے معاملے میں بھی آپ نے یہی کیا۔ جب تک آپ مکہ میں رہے روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نمازوں کے لیے اس طرح کھڑے ہوتے کہ بیت اللہ اور بیت المقدس دونوں سامنے ہوتے لیکن جب آپ نے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو سمت کے تبدیل ہو جانے کی وجہ سے بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا امکان باقی نہیں رہا۔ قدرتی طور پر خانہ کعبہ سے یہ انقطاع آپ کے قلب مبارک پر شاق گزرا اور آپ کو اس بارے میں وحی الٰہی کا انتظار رہنے لگا۔ لیکن حکمتِ الٰہی اس بات کی مقتضی ہوئی کہ ابھی کچھ عرصہ تک آپ اور بیت المقدس ہی کی طرف نماز پڑھیں۔ چنانچہ ہجرت کے بعد بھی ۱۶، ۱۷ مہینے آپ بیت المقدس ہی کی طرف نمازیں پڑھتے رہے، یہاں تک کہ غزوہ بدر سے کم و بیش دو ماہ پہلے قبلہ کی تبدیلی کا حکم نازل ہوا۔

دین میں آزمائشوں کی حکمت

اللہ تعالیٰ نے اتنے عرصہ تک بیت المقدس کے قبلہ پر قائم رکھنے اور پھر اس سے ہٹا کر خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دینے کی حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ اس طرح اس نئے مسلمانوں کو ایک امتحان میں ڈال کر ان کے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کیا ہے تاکہ مدینہ آنے کے بعد جو خام قسم کے عناصر اہل کتاب میں سے مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں وہ اس امتحان سے گزر کر یا تو اسلام کی طرف یک سو ہو جائیں یا چھٹ کر ان سے الگ ہو جائیں۔

وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ۔ یعنی یہ قبلہ کی تبدیلی ہے تو ایک سخت امتحان اس لیے کہ اس طرح کے معاملات میں جن کا تعلق دین سے ہو اور دین کی بھی ایک بنیادی چیز سے، آدمی فطری طور پر جذباتی اور روایت پرست بن جایا کرتا ہے، ان میں کوئی معمولی سی تبدیلی بھی اس کو سخت گراں گزرتی ہے، لیکن دین میں اصلی چیز جس کا وزن ہے وہ خدا اور رسول کی کامل اطاعت اور اخلاص ہے، اس وجہ سے ان تعصبات پر جو اخلاص کے لیے حجاب بنتے ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیا وقتاً فوقتاً ضرب لگاتے رہے ہیں۔ انبیا اور ادیان کی تاریخ گواہ ہے کہ ہر نبی کی آمد پر امتوں کو اس قسم کے امتحانوں سے گزرنا پڑا ہے۔ یہ امتحان اللہ تعالیٰ کی ایک سنت ہے، اسی سنت کے تقاضے سے ہر نبی کے زمانے میں دین کے رسوم و ظواہر میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں تاکہ کھرے اور کھوٹے میں امتیاز ہو سکے۔ جو لوگ اپنے قومی اور گروہی تعصبات کے پھندوں میں گرفتار ہو چکے ہیں ان کا کھوٹ ان امتحانوں سے ظاہر ہو جاتا ہے، وہ خدا اور رسول کی ہدایت اختیار کرنے کے بجائے اپنی روایات پر اڑ جاتے ہیں لیکن جن کے اندر اخلاص کی روح موجود ہوتی ہے وہ اپنے اس اخلاص کے فیض سے اللہ کی ہدایت قبول کرنے کی توفیق پاتے ہیں — چنانچہ قبلہ کی اس تبدیلی کا ردِ عمل بھی اسی طرح کا ہوا جو لوگ اپنے

پچھلے تعصبات میں پلٹے ہوئے محض کسی وقتی مصلحت کے تحت اسلام کی صفوں میں آگھسے تھے اس تبدیلی کے بعد وہ پھر پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے برعکس جو لوگ محض اللہ کی بندگی اور اس کے رسول کی اطاعت کے جذبے کے ساتھ اسلام میں آئے تھے ان کے لیے اس تبدیلی نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور رحمت کے نہایت وسیع دروازے کھول دیے۔

ایک اہم سوال کا جواب

یہ بات کہ اللہ کا معاملہ یوں نہیں ہے کہ وہ تمہارے ایمان کو ضائع کرے، وہ تو لوگوں کے معاملہ میں نہایت مہربان ہے۔ یہاں ایک نہایت اہم سوال کا جواب ہے جو از خود پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جب قبلہ کی تبدیلی خود قرآن کے اپنے بیان کے مطابق بھی ایک سخت امتحان ہے تو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس قسم کے سخت امتحان میں کیوں ڈالنا پسند فرمایا، جس کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ بہت سے لوگ اس امتحان میں ناکام رہ جانے کے سبب سے اپنے ایمان ہی کھو بیٹھیں۔ قرآن نے اس شبہ کا ازالہ اس طرح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس طرح کے امتحانوں میں اس لیے نہیں ڈالتا کہ لوگ اپنے ایمان ضائع کر بیٹھیں بلکہ یہ امتحان اللہ تعالیٰ کی رأفت و رحمت کے مظہر ہیں۔ انھی امتحانوں سے بندوں کی صلاحیتیں نشو ونما پاتی ہیں۔ انھی کے ذریعہ سے ان کی وہ قوتیں اور صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں جن کے خزانے قدرت نے ان کے اندر ودیعت کیے ہیں۔ انھی کے ذریعے سے ان کے کھرے اور کھوٹے، ان کے مخلص اور منافق اور ان کے سچے اور جھوٹے میں امتیاز ہوتا ہے۔ یہ امتحان نہ ہو تو اچھے اور برے، خام اور پختہ، گہرا اور پشنیر میں کوئی فرق ہی نہ رہ جائے۔ ہر مدعی کو اس کے دعوے میں سچا ماننا پڑے اور ہر کاذب کی باتوں کی تصدیق کرنی پڑے، یہاں تک کہ آخرت میں بھی کسی کو انعام یا کسی کو سزا دینے کے لیے کوئی حجت و دلیل باقی نہ رہ جائے۔ مزید غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اس کارخانۂ کائنات کا سارا حسن و جمال اور اس کی ساری حکمت و برکت اللہ تعالیٰ کی اسی سنتِ ابتلا کے اندر مضمر ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو یہ سارا کارخانہ بالکل بے حکمت اور بے مصلحت بلکہ کھلنڈرے کا ایک کھیل بن کے رہ جائے۔

زبان کا یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے اسما میں سے رؤف اور رحیم کا حوالہ دیا ہے۔ رؤف رأفت سے ہے جس کے اندر دفع شر غالب ہے اور رحیم رحمت سے ہے جس کے اندر اثباتِ خیر کا پہلو نمایاں ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہی دونوں پہلو اللہ تعالیٰ کی اس سنت ابتلاء و امتحان میں ملحوظ ہیں جس کی طرف یہ آیت اشارہ کر رہی ہے یعنی بندوں کو خرابیوں اور کمزوریوں سے پاک کر کے فضائل و محاسن سے آراستہ کرنا۔ یہاں ان اشارات پر ہم کفایت کرتے ہیں، آگے مختلف مقامات پر یہ سنت اللہ مختلف پہلوؤں سے زیر بحث آئے گی۔

عام طور پر مفسرین نے اس آیت کو اس سیاق میں لیا ہے کہ تحویلِ قبلہ کے بعد لوگوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ جو لوگ پہلے ہی قبلہ کے دوران میں وفات پا چکے ان کا کیا بنے گا۔ ان کی نمازیں قبول ہوں گی یا نہیں؟ یہ اس سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک نہ تو اس سوال کے پیدا ہونے کی کوئی وجہ تھی اور

نہ اس کے جواب دینے کی ضرورت تھی۔ اصل حقیقت وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔

عربی زبان کا ایک خاص اسلوب

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا۔ یہاں عربی زبان کا ایک خاص اسلوب اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے وہ یہ کہ افعالِ ناقصہ کے صیغے عموماً مضارع سے پہلے حذف کر دیے جاتے ہیں مثلاً "کَانَ یَفْعَلُ" میں صرف "یفعل" کو کافی سمجھیں گے کلامِ عرب اور قرآن مجید دونوں میں اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ چند مثالیں ہم قرآن سے پیش کرتے ہیں۔

سورۂ ہود میں ہے۔

فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ (۱۰۹۔ ھود)

پس تم ان چیزوں سے شک میں نہ پڑو جن کو یہ پوجتے ہیں، یہ ان چیزوں کو نہیں پوجتے مگر اسی طرح جس طرح اس سے پہلے ان چیزوں کو ان کے باپ دادا پوجتے تھے۔

اس آیت میں دیکھیے "کَمَا کَانَ یَعْبُدُ" کی بجائے صرف "کَمَا یَعْبُدُ" فرمایا۔ "کَانَ" کو حذف کر دیا۔

اسی طرح سورہ زخرف میں ہے۔

وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۷۔۶ زخرف)

اور ہم نے کتنے نبی بھیجے اگلوں میں، اور نہیں آتا تھا ان کے پاس کوئی نبی مگر وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔

اس میں "وَمَا یَاْتِیْهِمْ" دراصل "وَمَا کَانَ یَاْتِیْهِمْ" ہے۔ لیکن عربی اسلوب کے مطابق "کان" کو حذف کر دیا۔

سورۂ انعام میں ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۷۵۔ انعام)

اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے کارخانہ کا مشاہدہ کراتے تھے۔

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ "نُرِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ" دراصل "کُنَّا نُرِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ" ہے لیکن عام اسلوب کے مطابق مضارع سے پہلے "کُنَّا" حذف ہو گیا۔

اسی اسلوب کے مطابق آیت زیرِ بحث میں "قَدْ نَرٰی" دراصل "قَدْ کُنَّا نَرٰی" ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اس حذف کو کھول دیا ہے اس لیے کہ اردو میں حذف کا یہ اسلوب بیان نہیں ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ ہم تمہارے چہرے کی گردش آسمانوں کی طرف دیکھتے رہے تھے کہ تمہیں تحویلِ قبلہ کے لیے شدت سے انتظار ہے تو ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم تمہیں اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس کو تم پسند کرتے ہو۔

تحویلِ قبلہ کے لیے آنحضرتؐ کے انتظار کی وجہ

اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ میں رہے اس وقت تک تو دونوں قبلوں کو جمع کر لینا ممکن رہا لیکن مدینہ ہجرت فرما جانے کے بعد یہ صورت باقی نہیں رہی۔ اس وجہ سے قبلہ ابراہیمی

سے یہ انقطاع آپ پر شاق گزرنے لگا۔ بالخصوص جب وحی الٰہی کے ذریعے سے آپ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ آپ ملتِ ابراہیم پر مبعوث ہوئے ہیں، آپ کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی، نیز حضرت ابراہیم کا قبلہ ہی درحقیقت تمام اولادِ ابراہیم کا مشترک قبلہ ہے تو برابر آپ کو تحویلِ قبلہ کا انتظار رہنے لگا اور جیسا کہ قاعدہ ہے اگر کسی کا انتظار ذوق و شوق کے ساتھ ہو تو بار بار نگاہ دروازے کی طرف اٹھ جاتی ہے اسی طرح آپ کی نظر بار بار اوپر آسمان کی طرف اٹھ جاتی، اس لیے کہ حضرت جبریل امین کا ظہور اسی طرف سے ہوتا تھا۔

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ کے لفظ میں اس فیصلہ کا اظہار ہے جو اللہ تعالیٰ نے تحویلِ قبلہ کے بارے میں فرمایا۔ میں نے ترجمہ میں لفظ کے اس مخفی مضمون کو کھول دیا ہے لیکن ضرورت اس پر بعض نظائر کے حوالہ کی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بعض نظائر کی طرف اشارہ کیا تھا مگر افسوس ہے کہ دمِ تحریر میرے پاس حوالہ کی ضروری کتابیں موجود نہیں ہیں۔ ممکن ہے کتاب کی طباعت کے موقع پر اس کمی کی تلافی کر سکوں۔

تحویلِ قبلہ کے باب میں اصل حکم

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ۔ شطر کے معنی جہت، جانب اور طرف کے ہیں۔ مسجد حرام سے مراد وہ مسجد محترم ہے جو بیت اللہ کو اس کی ہر جہت سے ہالہ کی طرح اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ قبلہ تو دراصل بیت اللہ ہی ہے چنانچہ مسجد حرام کے اندر لوگ ہر چہار طرف سے بیت اللہ ہی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں لیکن باہر والوں کے لیے یہ مسجد بھی قبلہ ہی کے حکم میں داخل ہے۔ اس طرح امت کے لیے قبلہ کے معاملہ میں تھوڑی سی وسعت اور آسانی پیدا کر دی گئی ہے۔ جس طرح اصل قربان گاہ تو دراصل مروہ ہے لیکن امت کی آسانی کے لیے اس کو منیٰ تک وسعت دے دی گئی ہے۔

ہمارے نزدیک یہی آیت ہے جس نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے کی اس اجازت کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع شروع میں دی گئی تھی، منسوخ کیا اور اس کی جگہ مسجد حرام کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا۔ اس حکم کے ساتھ یہ جو فرمایا کہ تم جہاں کہیں بھی ہو تو اپنے رخ اسی کی طرف کرو، یہ مسلمانوں کو اس غلطی سے بچانے کے لیے ہدایت دی گئی ہے جس میں یہود و نصاریٰ مبتلا ہو گئے تھے۔ اوپر آیت ۱۱۵ کی وضاحت کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہود و نصاریٰ بیت المقدس کے اندر تو بیت المقدس کو قبلہ بناتے تھے لیکن اس سے باہر نکل کر ان کا قبلہ مشرق یا مغرب بن جاتا۔ اس امت کو اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی گمراہی سے بچانے کے لیے یہ ہدایت فرمائی کہ تم جہاں کہیں بھی ہو، مسجد حرام کے اندر یا باہر، نمازوں کے اوقات میں تمہارا رخ اس معین قبلہ ہی کی طرف ہونا چاہیے۔

یہاں خطاب کی اس تبدیلی پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے جو اس آیت میں نہایت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

خطاب کی تبدیلی کی حکمت و بلاغت

پہلے تو خطاب واحد کے صیغہ سے ہے فَوَلِّ وَجْهَكَ پھر جمع کی صورت میں فرمایا فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ اس تبدیلی کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ پہلا خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیت امت کے وکیل کے ہے۔ اس دوسرے خطاب نے پہلے خطاب کے اس مضمر پہلو کو واضح کر دیا کہ اگرچہ وہ خطاب بظاہر ہے تو واحد کے صیغہ سے لیکن صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے نہیں ہے بلکہ اس میں پوری امت شامل ہے۔ علاوہ ازیں پہلے خطاب کے واحد کے صیغہ سے ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ کو تحویل قبلہ کے لیے جیسا کہ اوپر اشارہ ہے نہایت اضطراب تھا۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ پہلے خاص طور پر آپ کو مخاطب کر کے اس تبدیلی کی بشارت دی جائے۔

اس قبلہ کا حق ہونا اہل کتاب پر واضح تھا

وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ۔ أَنَّهُ سے مراد یہاں مسجد حرام کا اس امت کے لیے قبلہ ہونا ہے۔ اس بات کا حق ہونا اور خدا کی طرف سے ہونا اہل کتاب پر بالکل واضح تھا، اس لیے کہ اوپر جو تفصیلات قرآن نے پیش کی ہیں ان سے مندرجہ ذیل باتیں واضح طور پر سامنے آگئی ہیں۔

ایک یہ کہ یہود کو یہ بات معلوم تھی کہ بیت اللہ حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ کی تعمیر ہے اور یہی بیت اللہ تمام ذریت ابراہیم کا اصلی قبلہ رہا ہے۔

دوسری یہ کہ آخری نبی ذریت اسماعیلؑ میں پیدا ہوں گے اور ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ایک امت مسلمہ برپا کرے گا۔

تیسری یہ کہ اس ذریت اسماعیل کا مرکز اور قبلہ شروع سے یہی بیت اللہ رہا ہے۔

ان تمام باتوں کے اشارات و قرائن تورات میں موجود تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور اور آپ کے واقعات زندگی سے ہر قدم پر ان اشارات و قرائن کی تصدیق ہو رہی تھی لیکن یہود اس حسد اور عناد کے سبب سے جو ان کو بنی اسماعیل اور مسلمانوں سے تھا، جانتے بوجھتے ان ساری باتوں کو چھپاتے تھے۔ ان کے اسی کتمان حق پر بانداز تہدید یہ فرمایا ہے کہ "جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے" یعنی یہ اپنے اس کتمان حق کی قرار واقعی سزا پا کے رہیں گے۔

وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَّا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَا أَنتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُم بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۚ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ (۱۴۵)

ایک التفات

یہ آیت بطور التفات کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دے رہی ہے کہ قبلہ کے معاملہ میں اہل کتاب کا یہ رویہ کسی شک و شبہ کی بنا پر نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اوپر واضح ہوا، دیدہ دانستہ محض ضد و عناد اور حسد کی بنا پر ہے۔ اس وجہ سے اگر تم ان کو دنیا جہان کے تمام معجزے بھی دکھا دو جب بھی یہ تمہارے قبلہ

کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں۔ ان کو مطمئن کرنے والی کوئی چیز ہو سکتی ہے تو دلائل و معجزات نہیں بلکہ یہ کہ تم خود ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے بن جاؤ لیکن حق کے اچھی طرح واضح ہو چکنے کے بعد تمہارے لیے اس کا کوئی امکان باقی نہیں رہا کہ تم ان کے قبلہ کی پیروی کر سکو۔ پھر یہ بات بھی واضح فرما دی کہ یہ ضد م ضد کا رویہ کچھ تمہارے ہی ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ یہود و نصاریٰ خود ایک دوسرے کے قبلہ کی بھی پیروی نہیں کر سکتے۔ اب یہ مشرق و مغرب کے جس جھگڑے میں پڑ گئے ہیں یہ جھگڑا ختم ہونے والا نہیں، اور جب ایک ہی قبلہ کی پیروی کے مدعی آپس میں متحد نہیں ہو سکتے تو تمہارے قبلہ کی پیروی بھلا یہ کس طرح کر سکتے ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ علم وحی کے آجانے کے بعد اگر تم ان کی خواہشوں کی پیروی کرو گے تو تم بھی ظالموں میں سے بن جاؤ گے۔ یہ ایک نوع کی تہدید ہے جس کا ظاہر اخطاب تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس کا رخ درحقیقت یہود و نصاریٰ کی طرف ہے۔ یہاں "العلم" سے مراد علم حقیقی ہے جو وحی کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اور اھواء سے مراد اہل کتاب کی بدعتیں ہیں۔ ان دونوں لفظوں کا مفہوم آیت ۱۲۰ کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (۱۴۶)

"اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ" سے مراد یہاں صالحین اہل کتاب کا گروہ ہے جو اپنے علم کے حد تک اپنے دین پر قائم اور ان تمام پیشین گوئیوں کے ظہور کا دل سے متمنی تھا جو آخری بعثت سے متعلق ان کے صحیفوں میں موجود تھیں۔ اس سے صالحین اہل کتاب مراد لینے کے وجوہ و دلائل پوری تفصیل کے ساتھ ہم آیت ۱۲۱ کے تحت واضح کر چکے ہیں۔

"يَعْرِفُوْنَهٗ" میں ضمیر کا مرجع قرآن مجید اور اس کا یہ بیان ہے جو اس نے آخری بعثت اور اس کے قبلہ سے متعلق اوپر دیا ہے۔ یہ آیت بعینہٖ انہی الفاظ میں سورۂ انعام میں بھی وارد ہے۔ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ - ۲۰۔ انعام (جن کو ہم نے کتاب عنایت کی وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا کہ وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں)

تشبیہ کی بلاغت

بیٹوں کی طرح پہچاننے میں یہ تشبیہ مضمر ہے کہ جس طرح ایک مہجور باپ اپنے دور افتادہ بیٹے کے لیے پریشان و مضطرب رہتا ہے اور ایک مدت کی جدائی کے بعد جب وہ آتا ہے تو دور سے اس کے پیراہن کی خوشبو اس کے لیے نوید مسرت لاتی ہے اسی طرح یہ صالحین اہل کتاب آخری بعثت سے متعلق تمام پیشین گوئیوں کے ہر مصداق سے اچھی طرح آشنا ہیں اور ان میں سے جو مصداق بھی ان کے سامنے ظاہر ہوتا ہے وہ اس کا خیر مقدم یوسف گم گشتہ کی طرح کرتے ہیں۔ اچھے اہل کتاب کے اندر موعود و منتظر حق کے لیے انتظار و شوق کا جو جذبہ تھا اس کی تعبیر قرآن مجید نے ایک اور مقام میں اس طرح فرمائی ہے۔ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ

تَرٰٓی اَعْیُنَھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاکْتُبْنَا مَعَ الشّٰھِدِیْنَ ۸۳ - مائدہ (اور جب وہ اس چیز کو سنتے ہیں جو رسول کی طرف اتاری گئی ہے تو تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اس حق کی وجہ سے جس کو وہ اس کے اندر پہچانتے ہیں۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو حق کی شہادت دینے والوں کے ساتھ لکھ۔)

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ (۱۴۷)

مبتدا کو محذوف کرنے کی بلاغت

اَلْحَقُّ ہمارے نزدیک خبر ہے اور مبتدا اس کا محذوف ہے۔ اگر مبتدا کو واضح کر دیا جائے تو پوری بات یوں ہوگی۔ ھٰذَا ھُوَ الْحَقُّ یعنی یہی بات حق ہے۔ مِنْ رَّبِّکَ خبر سے متعلق ہے۔ مبتدا کو عموماً عربی میں اس موقع پر حذف کر دیتے ہیں جہاں مخاطب کی پوری توجہ خبر پر مرکوز کر دینی ہو۔ اَلْحَقُّ آیت ۱۴۴ میں خبر ہی کے محل میں وارد ہے اور اسی حیثیت سے وہ آیت ۱۴۹ میں بھی آیا ہے۔ فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ کا خطاب ظاہر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے لیکن تنبیہ و عتاب کا رخ مخالفین کی طرف ہے۔ ملاحظہ ہو آیت نمبر ۱۴۵[1]

وَلِکُلٍّ وِّجْھَۃٌ ھُوَ مُوَلِّیْھَا فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ ط اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یَاْتِ بِکُمُ اللّٰہُ جَمِیْعًا ط اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۱۴۸)

لفظ کل کا مفہوم

"کل" کا لفظ اگرچہ لفظاً نکرہ ہے لیکن عموماً اس سے مراد وہ خاص گروہ یا اشخاص ہی ہوتے ہیں جن کا ذکر کلام میں اوپر گزر چکا ہوتا ہے مثلاً وَوَھَبْنَا لَہٗٓ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَکُلًّا جَعَلْنَا نَبِیًّا ۴۹ - مریم (اور ہم نے اس کو عطا کیے اسحاق اور یعقوب اور ان میں سے ہر ایک کو نبی بنایا) وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِدْرِیْسَ وَذَا الْکِفْلِ کُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِیْنَ ۸۵ - انبیاء (اور اسماعیل، ادریس اور ذوالکفل، ان میں سے ہر ایک صابروں میں سے تھا)

چنانچہ یہاں بھی "کل" سے مراد یہود و نصاریٰ کے وہی گروہ ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ ان کے متعلق فرمایا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے قبلہ کے لیے ایک جہت ٹھہرا لی ہے۔ کسی نے مشرق، کسی نے مغرب، یہ اپنی اسی ٹھہرائی ہوئی جہت ہی کو قبلہ بنائیں گے، تم کتنا ہی زور لگاؤ یہ پتھر کسی طرح اپنے مقام سے کھسکنے والے نہیں ہیں، اس وجہ سے تم ان کے پیچھے اپنی راہ کھوٹی نہ کرو بلکہ خدا کی دکھائی ہوئی صراط مستقیم پر آگے بڑھو اور نیکیوں اور بھلائیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔

تحویل قبلہ کے معاملہ میں اہل کتاب کے رویے سے اظہار بیزاری

گویا وہی بات جو اوپر والی آیت میں فرمائی تھی کہ وَلَئِنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ بِکُلِّ اٰیَۃٍ

---

[1] خطاب کے مختلف پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے مناسب ہے کہ مولانا فراہیؒ کے مقدمہ تفسیر میں خطاب کی فصل غور سے پڑھ لیجیے۔ تفسیر سورہ عبس بھی اس مقصد کے لیے مفید رہے گی۔

ثُمَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ الایۃ اس آیت میں ایک دوسرے اسلوب سے فرمادی۔ مقصود اس سے ہرگز ہرگز قبلہ کے معاملہ میں کسی رواداری کا اظہار نہیں ہے بلکہ یہ یہود و نصاریٰ کے رویہ سے بیزاری کا اظہار ہے۔ مسلمانوں کو اس بات کی نصیحت کی جارہی ہے کہ ان جامدوں اور ہٹ دھرموں کو ان کے حال پر چھوڑ دو اور تم حصولِ سعادت کی راہ میں آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔

قبلہ راہِ عبدیت میں مسابقت کے لیے ایک نشان ہے

فَاسْتَبِقُوا کا مصدر استباق ہے جس کے معنی ہیں دوڑ میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہوئے سبقت لے جانے کی کوشش کرنا مثلاً اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ، ۱۷ یوسف (ہم دوڑ میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہوئے دور نکل گئے) جس طرح دوڑ کے مقابلوں میں ایک نشان ٹھہرا کر ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح قبلہ عبدیت و انابت اور فلاح و سعادت کی جدوجہد میں مقابلہ کے لیے خدا کا مقرر کردہ ایک نشان یا گول ہے۔ اس نشان کو، جیسا کہ اوپر تفصیل گزر چکی ہے، پچھلی امتوں نے ضائع کر دیا تھا اس وجہ سے ان کی بھاگ دوڑ بھی بالکل دوسری وادیوں میں ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس نشانِ حق کو امتِ وسط کے لیے پھر نمایاں کیا اور اس کو دعوت دی کہ اگر دوسرے اس میدان میں اترنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو اور تم اپنی سرگرمیوں سے اس میدان کو پھر گرم کرو۔

قبلہ کے متعلق یہ بات کہ وہ فلاح و سعادت کے حصول کے لیے ایک نشان اور عَلَم کی حیثیت رکھتا ہے محض کوئی استعارہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے اس عظیم تاریخ کو حافظہ میں از سرِ نو تازہ کرنے کی کوشش کیجیے جو اس گھر کے ایک ایک پتھر پر نقش ہے جس کو قبلہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ گھر وہ گھر ہے جس کی تعمیر ابراہیم خلیل اللہؑ اور اسمٰعیل ذبیح اللہؑ نے اپنے مقدس ہاتھوں سے کی ہے۔ یہ گھر وہ گھر ہے جو اس دنیا کے بتکدے میں خدائے واحد کی عبادت کا اولین مرکز ہے۔ اسی گھر کے پہلو میں مروہ پہاڑی ہے جس کے دامن میں چشمِ فلک نے رضائے الٰہی کے لیے بوڑھے باپ کو محبوب اور اکلوتے فرزند کی گردن پر چھری چلاتے اور اسلام کی حقیقت کا مظاہرہ کرتے دیکھا ہے۔ یہی گھر ہے جس کے اردگرد کے چٹیل میدانوں کو قدرت نے اس امتِ مسلمہ کے نشو و نما کے لیے منتخب فرمایا جس کے ذریعہ سے دنیا کی تمام قوموں کو خدا کی رحمت تقسیم ہونے والی تھی۔ یہی گھر ہے جو حضرت ابراہیم کے وقت سے لے کر برابر تمام قدوسیوں کا قبلہ رہا ہے۔ اور جس میں طواف و اعتکاف اور رکوع و سجود کی سعادت اتنے انسانوں نے حاصل کی ہے کہ جس طرح زمین کے ذروں اور آسمان کے ستاروں کا شمار ناممکن ہے اسی طرح ان نفوسِ قدسیہ کا شمار بھی ناممکن ہے۔ اسی کے قرب میں وہ میدان ہے جس کی ریت کا ایک ایک ذرہ توبہ و استغفار کے سجدوں کا گواہ اور خوفِ خدا سے رونے والوں کے آنسوؤں کا امین ہے۔ اسی گھر کے ایک کونے میں وہ مقدس پتھر ہے جس کو خدا کے دہنے ہاتھ سے تشبیہ دی گئی ہے اور جس کو ہاتھ لگا کر یا بوسہ دے کر لاکھوں کروڑوں انبیاء و صدیقین اور صلحاء و ابرار نے اپنے رب سے عہد بندگی و وفاداری استوار کیا ہے۔ اسی کے پاس وہ جمرات ہیں جو اس گھر کے دشمنوں کی ذلت و پامالی کی یادگار ہیں اور جن پر

سنگ باری کرکے اہل ایمان اپنے اندر برابر اعدائے دین کے خلاف جہاد کی روح تازہ کرتے رہے ہیں۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اسی گھر کے سایہ میں خدا کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پرورش پائی جن کے لائے ہوئے نور اور جن کی بخشی ہوئی ضیا نے تمام دنیا میں اجالا کر دیا۔

ایک ایسی عظیم روایات کے امین گھر کو قبلہ بنانے کے معنی یقیناً یہی ہیں کہ اس کو ایک نشان قرار دے کر ان روحانی خزانوں کے حصول کے لیے جدوجہد کی جائے جو سیدنا ابراہیمؑ سے لے کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک اس گھر کو ودیعت ہوئے یا دوسرے لفظوں میں اس کو ایک پاور ہاؤس سمجھیے جس سے پوری امت زندگی، حرارت، روشنی اور قوت حاصل کرتی ہے۔ جن لوگوں پر قبلہ کی عظمت و اہمیت کا یہ پہلو واضح نہیں ہے وہ اکثر اس امر میں حیران ہوتے ہیں کہ اینٹ اور پتھر کے بنے ہوئے ایک مکان کو دین میں اس درجہ اہمیت کیوں دے دی گئی ہے لیکن اوپر کی تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ اصل اہمیت اینٹ پتھر کے مکان کی نہیں بلکہ ان عظیم روایات کی ہے جو اس گھر سے وابستہ ہیں اور جو اس دنیا کی روحانی و ایمانی زندگی کا واحد ذریعہ ہیں۔ ان روایات کی وجہ سے ملت کے نظام اجتماعی میں اس گھر کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ایک جسم کے نظام میں قلب کو حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح قلب کے بغیر جسم کا وجود نہیں اسی طرح قبلہ کے بغیر ملت کا کوئی تصور نہیں۔ یہاں قبلہ سے متعلق ان اجمالی اشارات پر کفایت کرتے ہیں۔ آگے مناسب مواقع پر ہم اس کی اہمیت کے بعض دوسرے گوشوں پر بھی نظر ڈالیں گے۔

اَیۡنَ مَا تَکُوۡنُوۡا یَاۡتِ بِکُمُ اللّٰہُ جَمِیۡعًا، اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ، کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس قبلہ کو قبلہ قرار دے کر جہاں کہیں سے بھی تم نیکی اور بھلائی کی راہ میں کوئی جدوجہد کروگے وہ ضائع نہیں جائے گی، خدا تم کو ہر جگہ سے اکٹھا کرے گا اور تمھیں تمھاری ہر چھوٹی بڑی نیکی کا بدلہ دے گا۔ یہ استباق الی الخیر کے لیے ایک نشان کی طرح ہے۔ اس سے قرب و بُعد دل کے تعلق کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ ہر شخص ہر جگہ اس سے ربط قائم کر سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے تعلق رکھنے والوں کو ہر جگہ سے جمع کر سکتا ہے۔

دوسرا یہ کہ جو جس سمت بھی رخ کرنا چاہتا ہے اس کو کرنے دو، تم ان بحثوں میں الجھنے کی بجائے نیکی اور بھلائی کی راہوں میں بڑھو، ایک دن آئے گا جب اللہ تم سب کو جمع کرکے فیصلہ کرے گا کہ کون حق کی راہ چلا اور کس نے ضد اور ہٹ دھرمی کی روش اختیار کی۔

وَمِنۡ حَیۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡہَکَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَاِنَّہٗ لَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ ؕ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۹﴾

سفر میں اہتمام قبلہ کی ہدایت

اوپر آیت ۱۴۴ میں تحویلِ قبلہ کے اصلی حکم کے ضمن میں یہ بات تو واضح ہو گئی تھی کہ آدمی جہاں کہیں بھی ہو قبلہ ہی کی طرف رخ کرے لیکن سفر کی حالت سے متعلق وہاں کوئی تصریح نہیں تھی کہ اس صورت میں

بھی اس حکم کی پابندی ضروری ہے یا اس میں کچھ ڈھیل ہے۔ سفر کی حالت میں کسی متعین قبلہ کی جستجو اور تحقیق ایک دشوار کام ہے اس وجہ سے خیال یہی ہوتا ہے کہ اس میں کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن اوپر قبلہ کی جو اہمیت بیان ہوئی ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی حالت میں بھی اس روحانی پاور ہاؤس سے انسان کا تعلق منقطع نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر سفر کی حالت میں آزادی دے دی جاتی تو اس سے قبلہ کے معاملہ میں اس گمراہی کو اچھی خاصی راہ مل جاتی جس میں یہود و نصاریٰ مبتلا ہوئے۔ اس وجہ سے اس امت کو واضح الفاظ میں اس بات کی تاکید کی گئی کہ حضر کی طرح سفر میں بھی قبلہ کا اہتمام ضروری ہے تاکہ امت اپنے اصل نصب العین سے کسی حالت میں بھی سہل انگاری میں مبتلا نہ ہونے پائے۔

اس تاکید کے ساتھ ساتھ یہ تنبیہ بھی فرما دی کہ "یہی قبلہ خدا کا مقرر کیا ہوا واقعی قبلہ ہے، سو اس بات کو یاد رکھنا کہ اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے"۔ یہ تنبیہ عذر سفر کی بنا پر قبلہ کے معاملہ میں ہر قسم کی لاپروائی اور ہر قسم کی منافقانہ سہولت تراشی کی جڑ کاٹتی ہے۔ اس کے شروع میں خطاب واحد کے صیغہ سے ہے اور آخر میں جمع کے صیغہ سے، یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ شروع کا خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیتِ امت کے وکیل کے ہے، مراد اس سے پوری امت ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ سفر کی حالت میں چونکہ بسا اوقات قبلہ کا تعین سخت مشکل ہو جاتا ہے اس وجہ سے جو چیز شریعت میں مطلوب ہے وہ صرف موجود وسائل تحقیق کے حد تک قبلہ کی جستجو ہے۔ اسلام نے کسی معاملہ میں طاقت سے زیادہ امت پر کوئی بوجھ نہیں ڈالا ہے۔ بس میسّر وسائل تحقیق سے جو ظن غالب حاصل ہو جائے آدمی اسی کے مطابق نماز ادا کرے۔ یہ پابندی کسی صورت میں بھی ان رخصتوں کی نفی نہیں کرتی جو مجبوریوں کی حالت میں شریعت نے امت کو دی ہیں اور جن کی تصریح حدیث وفقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (۱۵۰)

اعادۂ حکم کی حکمت

اوپر سفر اور حضر دونوں حالتوں سے متعلق یہ دونوں حکم بیان ہو چکے ہیں۔ اس وجہ سے انھی دونوں حکموں کا معاً یہ اعادہ بعینہٖ انھی الفاظ میں اپنے اندر بظاہر کچھ تکرار کی سی گرانی رکھتا ہے اور یہ چیز قرآن میں، جو ایجاز و بلاغت کا ایک معجزہ ہے، طبیعت کو کچھ کھٹکتی ہے، لیکن یہ کھٹک محض قلت تدبر کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہاں ان احکام کے دہرانے سے مقصود ہرگز ہرگز ان احکام کو دوبارہ بیان کرنا نہیں ہے بلکہ ان کی ان تین عظیم حکمتوں اور مصلحتوں کو بیان کرنا ہے جو ان احکام کے اندر اس امت کے لیے پیش نظر ہیں اور جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔ یہ حکمتیں، بحیثیتِ مجموعی دونوں ہی حکموں سے، جیسا کہ آگے واضح ہوگا، تعلق رکھتی ہیں اور ان سے معمولی بے خبری یا بے پروائی بھی اس امت کو ایسی غلطیوں میں مبتلا کر سکتی ہے جن کی اصلاح

کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہ جائے گی اس وجہ سے قرآن نے ان حکمتوں کے بیان سے پہلے تمہید کے طور پر ان احکام کی طرف ذہنوں کو پھر متوجہ کر دیا کہ اس شد و مد اور اس تاکید و تنبیہ کے ساتھ اندر اور باہر، سفر اور حضر، ہر جگہ اور ہر صورت میں بیت اللہ ہی کی طرف رخ کرنے کا جو حکم دیا جا رہا ہے یہ کوئی سرسری اور سطحی حکم نہیں ہے۔ بلکہ نہایت عظیم مصلحتوں اور حکمتوں پر مبنی حکم ہے۔ اگر اس کو ٹھیک ٹھیک ملحوظ رکھنے میں تم نے ذرا بھی سہل انگاری سے کام لیا اور اس سہل انگاری کے سبب سے ایک قدم بھی غلط اٹھ گیا تو تمہارا سارا سفر ہی ایک غلط سمت میں ہو جائے گا۔ اس وجہ سے ان کا پورا پورا اہتمام کرو اور ان کی حکمتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ اس تمہید کے بعد اب آگے یہ حکمتیں ان الفاظ میں بیان ہو رہی ہیں۔

لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْكُمْ حُجَّةٌ ۗ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۗ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِیْ ۗ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ غور کیجیے تو واضح ہوگا کہ یہاں ان احکام کی تین حکمتیں بیان کی گئی ہیں ایک قطع حجت، دوسری اتمام نعمت، تیسری راہ یابی۔ اب ہم اختصار کے ساتھ ان تینوں کی تشریح کرتے ہیں تاکہ مذکورہ احکام کے اعادہ کا فائدہ اور نظم کلام اچھی طرح واضح ہو جائے۔

قطع حجت سے مراد یہ ہے کہ اہل کتاب بالخصوص یہود کے لیے بات بات میں تمہارے اوپر گرفت کرنے اور تمہارے خلاف بدگمانی پھیلانے کے لیے کوئی موقع باقی نہ رہ جائے۔ یہاں للناس سے مراد موقع کلام گواہ ہے کہ اہل کتاب ہیں۔ قبلہ کے اشتراک کی وجہ سے اہل کتاب بالخصوص یہود، قدم قدم پر آنحضرت صلعم اور مسلمانوں کے خلاف یہ اعتراض اٹھاتے رہتے تھے کہ جب یہ ہمارے قبلہ ہی کی طرف نماز پڑھتے ہیں تو نماز اور عبادت کے طریقوں میں ہمارے طریقہ سے الگ راہ کیوں اختیار کرتے ہیں، ایک بنیادی چیز میں اشتراک کے بعد دوسری چیزوں میں اختلاف کو وہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی من گھڑت ایجاد قرار دیتے تھے۔ ان کا یہ پروپگنڈا سادہ لوح لوگوں پر اثر انداز ہوتا تھا اور اس سے اس حقیقت کے واضح ہونے میں بڑی رکاوٹیں پیدا ہو رہی تھیں کہ حضورؐ کی بعثت یہودیت یا نصرانیت پر نہیں بلکہ ملت ابراہیم پر ہوئی ہے۔ اب وقت آگیا تھا کہ اس پروپگنڈے کا پوری طرح سدِ باب کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے وہ رخنہ بندیاں ضروری ہوئیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ فرض کیجیے یہ احتیاطیں نہ اختیار کی جاتیں، مسلمانوں کو آزاد چھوڑ دیا جاتا کہ جب وہ مسجد حرام سے باہر یا سفر کی حالت میں ہوں تو جس سمت کی طرف چاہیں نماز پڑھ لیا کریں تو قطع نظر اس سے کہ مسلمان قبلہ کے معاملہ میں اسی قسم کی گمراہی میں مبتلا ہو جاتے جس قسم کی گمراہی میں اہل کتاب مبتلا ہوئے، محض بعض حالات میں ظاہری اشتراک کی وجہ سے یہود مسلمانوں کے خلاف زبان درازی اور وسوسہ اندازی کی کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتے۔ مذکورہ قیدوں نے ان تمام رخنوں کو بند کر دیا۔ اگرچہ شریر لوگ اس قطع حجت کے بعد بھی باز رہنے والے نہیں تھے لیکن دنیا میں کوئی احتیاط بھی ہر قسم کے لوگوں کا منہ بند نہیں کر سکتی۔ ایسے لوگوں کا علاج قرآن نے یہ بتایا ہے کہ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِیْ (ان سے نہ ڈرو صرف مجھی سے ڈرو)

اتمامِ نعمت سے مراد تکمیلِ دین کی وہ نعمت ہے جس کی پیشین گوئی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام نے اس امت کے بارے میں فرمائی تھی اور جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس وقت فرمایا تھا جب وہ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے امتحان میں کامیاب ہوئے تھے۔ اس وقت ان سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اس بیٹے کی نسل سے ایک عظیم امت پیدا ہوگی جس سے تمام دنیا کی قومیں دین کی برکت پائیں گی۔ چنانچہ انھیں کی نسل سے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے لیے آخری ہادی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا، جن کا قبلہ وہ بیت اللہ قرار پایا جو تمام عالم کے لیے سرچشمۂ خیر و برکت اور تکمیلِ دین کا مرکز ٹھہرایا گیا تھا۔

راہ یابی سے مراد ہے اس صراطِ مستقیم کی راہ یابی جو خدا تک پہنچانے والی سیدھی اور فطری راہ ہے جس کے متعلق فرمایا گیا ہے۔ قُلْ اِنَّنِیْ ھَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۱۶۱ - انعام (کہہ دو، میرے رب نے میری رہنمائی ایک سیدھی راہ کی طرف فرمائی ہے - فطری دین —— ملتِ ابراہیم —— کی طرف جو بالکل یکسو تھا) اس ملتِ ابراہیم کی طرف رہنمائی کرنے والا مینارہ، جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں، یہ قبلہ ہی ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ رہنمائی کا یہ نشان ہمیشہ اس امت کی نگاہوں کے سامنے رہے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ یَتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَكِّیْكُمْ وَیُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (۱۵۱)

"کما" میں "ک" حرفِ تشبیہ ہے۔ اس وجہ سے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تشبیہ کس چیز کی دی گئی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ "کما" تقریباً اسی موقع میں استعمال ہوا ہے جس موقع میں ہم "چنانچہ" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے یہ قبلہ کی تحویل اسی طرح اتمامِ نعمت اور ملتِ ابراہیمؑ کی طرف رہنمائی کے لیے کی ہے جس طرح دعائے ابراہیمی کے مطابق انھی مقاصد کے لیے ایک رسول تمھارے اندر بھیجا ہے۔ اس آیت پر آیت ۱۲۹ کے تحت ہم مفصل بحث کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ آخر میں یہ جو فرمایا ہے کہ وَیُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ، یہ بنی اسماعیل پر ایک خاص فضل و کرم کا اظہار ہے کہ تم دین و شریعت سے ناآشنا امی لوگ تھے، خدا نے تمھاری تعلیم و ہدایت کے لیے اس پیغمبر کو بھیجا ہے تو تمھیں تو اس کی سب سے زیادہ قدر کرنی چاہیے۔

فَاذْكُرُوْنِیْۤ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِیْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ (۱۵۲)

اللہ تعالیٰ اور امتِ مسلمہ کے درمیان ایک عظیم معاہدہ

تحویلِ قبلہ کے حکم کے بعد یہ امت ایک بالکل ممتاز امت کی حیثیت سے سامنے آگئی۔ یہود امامت کے منصب سے معزول ہوئے اور شہادت علی الناس کی ذمہ داری قیامت تک کے لیے اس امت کے سپرد ہوئی۔ اس اہم موقع پر یہ یاددہانی کی گئی ہے کہ تم مجھے یاد رکھو گے تو میں تمھیں یاد رکھوں گا، میری شکرگزاری کرتے رہنا، ناشکری نہ کرنا۔ اس یاددہانی کی نوعیت اللہ تعالیٰ اور اس امت کے درمیان ایک عظیم معاہدے کی ہے اور خدا کو یاد رکھنے

سے مقصود ان تمام ذمہ داریوں اور فرائض کو یاد رکھنا اور ان کی بجا آوری ہے جو اس امت کے سپرد کیے جا رہے ہیں۔ ان ذمہ داریوں اور فرائض کی بجا آوری کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ میں تمھیں یاد رکھوں گا، یعنی دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی، نصرت، فتح مندی اور سرخروئی کے جو وعدے میں نے اس امت سے کیے ہیں وہ پورے کروں گا۔ "میری شکرگزاری کرتے رہنا" سے مراد ان تمام نعمتوں کا صحیح صحیح حق ادا کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہیں اور آئندہ ملنے والی ہیں، ان نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت خود وہ شریعت تھی جو اب اپنی کامل شکل میں اس امت کو منتقل ہو رہی تھی، آخر کے الفاظ وَلَا تَكْفُرُونِ (اور میری ناشکری نہ کرنا) میں تنبیہ ہے کہ اگر تم نے ناشکری کی تو جس طرح یہود ناشکری کر کے کیفر کردار کو پہنچے خدا کے اس قانون کی زد سے تم بھی نہ بچ سکو گے۔

بعینہٖ اسی طرح کی یاددہانی بنی اسرائیل کو بھی کی گئی تھی لیکن انھوں نے اس کی کوئی پروا نہ کی، قرآن مجید میں اس کا حوالہ اس طرح دیا گیا ہے۔ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ۴۰ بقرہ (میری اس نعمت کو یاد رکھو جو میں نے تم پر کی ہے اور میرے عہد کو پورا کرو، میں اس عہد کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا ہے اور مجھی سے ڈرو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (۱۵۳)

منصبِ امامت کی مشکلات اور ان کا علاج

اب اس آیت اور آگے کی چار آیات میں ان خطرات و مشکلات کے مقابلہ کی تدابیر بتائی جا رہی ہیں، جو اس منصبِ امامت کے بعد پیش آئیں گی یا پیش آسکتی ہیں۔ یہود کو مسلمانوں کے ساتھ جو عناد تھا وہ تو اچھی طرح اوپر واضح ہو چکا ہے مگر قبلہ کے اس اشتراک کی وجہ سے یہود اب تک اس تمام اختلاف و نزاع کے اندر اتفاق کی بھی ایک جھلک دیکھتے تھے، لیکن تحویلِ قبلہ کے بعد انھوں نے کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ مسلمان اب ملتِ ابراہیمؑ کے وارث کی حیثیت سے اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ ان سے بالکل ممیز ہو کر سامنے آگئے ہیں۔ اس چیز نے قدرتی طور پر مسلمانوں کے خلاف ان کے غیظ و غضب کو دوچند کر دیا۔ اسی طرح قریش جو مسلمانوں کو مکہ سے نکال کر اس طمعِ خام میں مبتلا ہو گئے تھے کہ یہ دعوت ایک اجنبی ماحول میں آپ سے آپ دب جائے گی، اب یہ محسوس کرنے لگے کہ ان کی توقعات کے خلاف، مسلمان مدینہ میں ایک طاقت بنتے جا رہے ہیں اور ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ملتِ ابراہیمؑ کے اصلی وارث اور خانہ کعبہ کے جائز متولی وہی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اب اس گھر کو اپنا قبلہ بھی بنا لیا ہے، جس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اب وہ اس پر قبضہ بھی کرنے کی کوشش کریں۔ اس احساس نے انھیں بھی چوکنا کیا اور وہ اس خطرے کے سدِ باب کی تدبیریں سوچنے لگے، جس کے نتیجہ میں تحویلِ قبلہ کے دو ہی مہینوں کے بعد انھوں نے اس جنگ کے اسباب پیدا کر دیے جو تاریخ اسلام میں غزوۂ بدر کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ کے متعلق ہماری تحقیق، جیسا کہ ہم سورۂ انفال کی تفسیر میں پیش کریں گے، یہ ہے کہ یہ یہود مدینہ اور قریش مکہ کی باہمی سازش سے ہوئی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان، جو اب ایک مستقل امت

کی حیثیت سے ملت ابراہیمی اور قبلہ ابراہیمی کے دعوے دار بن کر اٹھ رہے ہیں، ان کا زور اٹھنے سے پہلے ہی توڑ دیا جائے۔

یہ حالات اگرچہ ابھی پس پردہ تھے لیکن اس خدائے علام الغیوب سے مخفی نہیں تھے جو کھلے اور چھپے سب سے باخبر ہے۔ اس وجہ سے اس کی رحمت اور حکمت متقضی ہوئی کہ وہ مسلمانوں کو آنے والے خطرات سے متنبہ بھی فرمائے اور ان خطرات کے مقابلہ میں جو چیز ان کے عزم و حوصلہ کو برقرار رکھ سکتی ہے، اس کی ہدایت بھی فرمائے۔

اس سلسلہ کی پہلی بات جو، آیت زیر بحث میں ارشاد ہوئی، یہ ہے کہ پیش آنے والی مشکلات میں صبر اور نماز سے مدد چاہو۔ صبر اور نماز کی لغوی تحقیق، ان کے باہمی تعلق اور اقامت دین کی جدوجہد میں ان کی عظمت و اہمیت پر تفصیلی گفتگو ہم اسی سورہ کی آیت ۴۵ کے تحت کر چکے ہیں۔ نیز فصل ۲۲ میں بھی ان کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی جا چکی ہے اس وجہ سے یہاں کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ بعض باتیں مخصوص اس مقام سے متعلق ہیں جن کی طرف اشارہ ضروری ہے۔

ایک تو یہ کہ مشکلات و مصائب میں جس نماز کا سہارا حاصل کرنے کا یہاں ذکر ہے اس سے مراد صرف پانچ وقتوں کی مقررہ نمازیں ہی نہیں ہیں بلکہ تہجد اور نفل نمازیں بھی ہیں۔ اس لیے کہ یہی نمازیں مومن کے اندر وہ روح اور زندگی پیدا کرتی ہیں جو راہ حق میں پیش آنے والی مشکلات پر فتح یاب ہوتی ہے، انھی کی مدد سے وہ مضبوط تعلق باللہ پیدا ہوتا ہے جو کسی سخت سے سخت آزمائش میں بھی شکست نہیں کھاتا، اور انھی سے وہ مقام قرب حاصل ہوتا ہے جو خدا کی اس معیت کا ضامن ہے جس کا اس آیت میں صابرین کے لیے وعدہ فرمایا گیا ہے۔ اس حقیقت کی پوری وضاحت کی سورتوں میں آئے گی اس وجہ سے یہاں ہم صرف اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

دوسری یہ کہ نماز تمام عبادات میں ذکر اور شکر کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ قرآن مجید میں مختلف طریقوں سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ نماز کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی شکرگزاری ہے۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اوپر اس امت سے یہ عہد جو لیا گیا ہے فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي، اس کے قیام میں نماز سب سے بہتر وسیلہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

تیسری یہ کہ یہ نماز دعوت دین اور اقامت حق کی راہ میں عزیمت و استقامت کے حصول کے لیے مطلوب ہے۔ اس وجہ سے اس نماز کی اصلی برکت اس صورت میں ظاہر ہوتی ہے جب آدمی راہ حق میں باطل سے کشمکش کرتا ہوا اس کا اہتمام کرے۔ جو شخص سرے سے باطل کے مقابل میں کھڑے ہونے کا ارادہ ہی نہیں کرتا ظاہر ہے کہ اس کے لیے یہ ہتھیار کچھ غیر مفید ہی بن کر رہ جاتا ہے۔

چوتھی یہ کہ یہاں صبر اور نماز سے مدد حاصل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ اللہ نماز پڑھنے والوں اور صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اس کی وجہ استاذ امام کے

نزدیک یہ ہے کہ نماز میں خدا کی معیت کا حاصل ہونا اس قدر واضح چیز ہے کہ اس کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں تھی، واضح کرنے کی بات یہی تھی کہ جو لوگ راہِ حق میں ثابت قدم رہتے ہیں اور اس ثابت قدمی کے حصول کے لیے نماز کو وسیلہ بناتے ہیں، اللہ ان کے ساتھ ہو جاتا ہے۔

پانچویں یہ کہ اللہ کی معیت جس کا یہاں ثابت قدموں کے لیے وعدہ کیا گیا ہے کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ موقع کلام گواہ ہے کہ یہاں ان دو لفظوں کے اندر بشارتوں کی ایک دنیا پوشیدہ ہے، تمام کائنات کا بادشاہ حقیقی اور تمام امر و اختیار کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے تو جب وہ کسی کی پشت پر ہے تو اس کو دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی کس طرح شکست دے سکتی ہے؟

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (۱۵۴)

زندگی اور موت سے متعلق صحیح تصور

راہ عزیمت و استقامت میں استوار رہنے کے لیے دوسری چیز جو مطلوب ہے یہ اس کی طرف اشارہ ہے یعنی زندگی اور موت سے متعلق صحیح اسلامی تصور کا استحضار، جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے نزدیک تو زندگی نام بس اسی دنیا کی زندگی کا ہے، جو آدمی مرا یا مارا گیا بس وہ ختم ہو گیا۔ لیکن مومن کے نزدیک تو یہ زندگی چند روزہ اور فانی زندگی ہے، اصلی زندگی کا، جو ابدی ہے، آغاز تو اس کے نزدیک اس وقت سے ہوتا ہے، جب یہ زندگی ختم ہوتی ہے، یہ زندگی عالم برزخ اور پھر عالم آخرت میں حاصل ہوتی ہے۔ جہاں تک موت کے بعد زندگی کا تعلق ہے یہ حاصل تو کافر و مومن سب ہی کو ہوتی ہے لیکن کفار کی زندگی چونکہ کلفت اور عذاب کی ہوتی ہے اس وجہ سے وہ قابلِ ذکر نہیں۔ البتہ اہل ایمان برزخ کی زندگی میں بھی اپنے اپنے مراتب و مدارج کے لحاظ سے مسرور و شاد کام ہوتے ہیں۔ بالخصوص ان میں سے جو لوگ راہِ حق میں شہادت کا مرتبہ حاصل کرتے ہیں، ان کی برزخی زندگی کی کامرانیوں کا تو اس ناسوتی زندگی میں کوئی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنے مقدس خونِ شہادت سے اس دنیا کی کشتِ حق کو جو سیرابی اور زندگی بخشتے ہیں اس کے انعامات ان کو عالمِ برزخ ہی سے ملنے شروع ہو جاتے ہیں، چنانچہ ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۱۶۹۔ آل عمران (جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں ان کو مردے نہ خیال کرو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس روزی پا رہے ہیں)

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ (۱۵۵)

آگے کی مشکلات کی طرف اجمالی اشارہ

یہ ان آزمائشوں کی طرف اجمالی اشارہ ہے جو آگے کے مراحل میں پیش آنے والی ہیں۔ یہ آزمائشیں اگرچہ پیش تو آئیں گی دشمنوں کی شرارتوں اور سازشوں کے باعث لیکن چونکہ یہ اس سنت اللہ کے تحت ہیں جو ازل سے اللہ تعالیٰ نے اہل حق اور اہلِ باطل میں امتیاز کے لیے مقرر کر رکھی ہے اس وجہ سے ان کو منسوب اپنی طرف فرمایا ہے کہ ہم تمھیں آزمائیں گے، اور بات بصیغۂ تاکید فرمائی ہے۔ اس لیے کہ اہلِ حق کے لیے یہ

امتحان وآزمائش قانونِ الٰہی میں ناگزیر ہے۔ اس قسم کے امتحانوں سے گزر کر ہی بندوں کی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں اور ان کے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز ہوتا ہے۔ اس امتحان کے بغیر کوئی گروہ اللہ تعالیٰ کی اُخروی نعمتوں کا سزاوار قرار نہیں پاتا۔

خوف

اس سلسلہ میں سب سے پہلے خوف کا ذکر فرمایا ہے۔ خوف سے مراد دشمنوں کے حملہ وہجوم کا اندیشہ ہے۔ اوپر اشارہ گزر چکا ہے کہ ایک مستقل امت کی حیثیت سے نمایاں ہوتے ہی قریش نے بھی مسلمانوں پر حملے کے لیے بہانے پیدا کرنے شروع کر دیئے اور یہود نے بھی ریشہ دوانیاں شروع کر دیں، پھر آہستہ آہستہ ان کی طرف سے حملوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ باہر کی قوموں نے بھی اس میں دلچسپی لینی شروع کر دی اور یہ سلسلہ اس وقت جا کر ختم ہوا جب مسلمانوں نے اپنی عزیمت واستقامت سے اپنے تمام حریفوں کا زور اچھی طرح توڑ دیا۔

اس خوف کا ذکر "بشیئٍ" یعنی کسی قدر کی قید کے ساتھ کیا ہے جس سے مقصود مسلمانوں کی ہمت افزائی ہے کہ یہ حالت پیش تو آئے گی لیکن یہ اس مقدار سے زیادہ نہ ہو گی جو تمھاری عزیمت واستقامت کی جانچ کے لیے ضروری ہے، اس وجہ سے اس سے دل شکستہ اور پست ہمت ہونے کے بجائے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔

معاشی مشکلات

جوع سے مراد وہ معاشی مشکلات ہیں جو قریش اور یہود کی مشترکہ مخالفت، خوف وخطرے کی حالت اور ان کی طرف سے غذائی ناکہ بندیوں کے سبب سے پیش آ سکتی ہیں، اس وقت تک ملک کی تمام تجارت اور دوسرے معاشی وسائل و ذرائع پر عملاً یہود اور قریش ہی قابض تھے۔ اس وجہ سے ان کے ساتھ جھگڑا مول لینا، دریا میں رہتے ہوئے مگر مچھوں سے بَیر مول لینے کے ہم معنی تھا۔ لیکن حق کی رفاقت مقتضی تھی کہ مسلمان یہ خطرہ بھی مول لیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ خطرہ بھی مول لیا اور تاریخ گواہ ہے کہ یہ خطرہ ظاہر تو ہوا بعض حالات میں بہت ہی بھیانک شکل میں لیکن عزم وایمان کے مقابل میں یہ بھی ٹھہرا پرِ کاہ (بشیئٍ) ہی کے برابر۔

مال اور جان کی کمی

اس کے بعد اموال وانفس یعنی مال اور جان کی کمی کی آزمائش کی طرف اشارہ فرمایا اس لیے کہ جنگ وجہاد میں یہی دونوں چیزیں وسیلہ کار بنتی ہیں جس کے سبب سے سب سے زیادہ قربانی انھی کی دینی پڑتی ہے۔ نیز امن واطمینان کے فقدان کے سبب سے یہ اس نگہداشت سے بھی محروم ہو جاتی ہیں جو ان کی نشوونما کے لیے ضروری ہے۔

ثمرات

ثمرات کا ذکر اگرچہ اموال کے ذکر کے بعد بظاہر کچھ زائد سا معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ یہ بھی اموال میں شامل ہے۔ لیکن اس کے ذکر میں موقع کلام کی رعایت ملحوظ ہے۔ اہلِ عرب کی دولت یا تو اونٹ اور بھیڑ بکریاں تھیں جن کے لیے اموال کا لفظ استعمال ہوتا تھا یا پھر پھل خصوصاً کھجور۔ ملک کی اس مخصوص حالت کی وجہ سے اموال کے ساتھ ثمرات کا ذکر بھی ہوا۔

آخر میں ان لوگوں کو خوش خبری دی گئی ہے جو ان تمام آزمائشوں کے باوجود حق پر جمے رہیں، اور اپنے

عزم وایمان میں کوئی ضعف پیدا نہ ہونے دیں۔ یہ خوش خبری قرآن کی دوسری جگہ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی پر مشتمل ہے۔ مثلاً فرمایا ہے۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ	اے ایمان والو، کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت
عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ	کا پتہ نہ دوں جو تمہیں ایک دردناک عذاب سے
اَلِيْمٍ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	نجات دینے والی ہے؟ اللہ اور اس کے رسول پر
وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	ایمان لاؤ۔ اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور
بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ	جانوں سے جہاد کرو، یہ تمہارے لیے کہیں بہتر ہے،
خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝	اگر تم اس بات کو سمجھو۔ اللہ تمہارے گناہوں کو بخشے گا،
يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ	اور تمہیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے
يُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ	نہریں جاری ہوں گی اور ایسے اچھے مکانوں میں آباد کرے گا
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً	جو ابد کے باغوں میں ہیں، یہ دراصل سب سے بڑی
فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝	کامیابی ہے۔ مزید برآں ایک دوسری چیز بھی تمہیں
وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ	حاصل ہوگی جس کو تم عزیز رکھتے ہو، وہ ہے اللہ کی مدد
فَتْحٌ قَرِيْبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝	اور عنقریب حاصل ہونی والی فتح۔ اور اس بات
(۱۰-۱۳ صف)	کی ایمان والوں کو بشارت سنا دو۔

اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (۱۵۶)

صابرین کی ڈھال

یہ صابرین کی صفت بیان ہوئی ہے کہ وہ آزمائشوں کا مقابلہ بد دلی اور پست ہمتی کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ خندہ پیشانی اور عزم واستقلال کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہاں جو ان کا یہ قول نقل ہوا ہے، یہ درحقیقت ان کے اس عقیدے کا اظہار ہے جس کی چٹان پر صبر واستقامت کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ اس عقیدے کا ایک جزو تو یہ ہے کہ آدمی اس بات پر ایمان رکھے کہ وہ اس دنیا میں اللہ ہی کا اور اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کا دوسرا جزو یہ ہے کہ مرنے کے بعد اس کو اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ جو شخص ان دو حقیقتوں پر مضبوط ایمان رکھتا ہے کوئی بڑی سے بڑی مصیبت بھی اس کے قدم کو جادۂ حق سے ہٹا نہیں سکتی۔ جب ہم اس دنیا میں خدا ہی کے بھیجے ہوئے آئے ہیں، اسی کے لیے ہمارا مرنا اور جینا ہے اور مرنے کے بعد وہی ہے جس کی طرف ہمیں جانا ہے تو پھر اس کی خاطر تو ہم ہر چیز سے منہ موڑ سکتے ہیں لیکن وہ کون سی طاقت ہو سکتی ہے جو ہمارے رخ کو اس سے موڑ دے؟

یہی کلمہ صابرین کی ڈھال اور سپر ہے۔ اسی پر وہ مصیبت کے ہر وار کو روکتے ہیں۔ اس میں اللہ کی طرف جو تفویض وسپردگی ہے وہ سرفروشی اور جاں بازی کی سپردگی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ بندۂ مومن جب وقت آ

سچا تو یہی نعرہ لگاتا ہوا اپنے رب کے لیے دریا اور پہاڑ سے بھی لڑ جاتا ہے۔ وہ سب کے قدم اکھاڑ دیتا ہے لیکن اس کے قدم کو کوئی چیز بھی اکھاڑ نہیں سکتی۔

أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ (۱۵۷)

'صلوات' کا مفہوم

صَلَوَات، صلوٰۃ کی جمع ہے جس کے اصل معنی لغت میں "اقبال الی الشیء" یعنی کسی چیز کی طرف بڑھنے کے ہیں۔ اسی مفہوم کے اعتبار سے یہ لفظ نماز کے لیے استعمال ہوا کہ بندہ نماز میں اپنے رب کی طرف بڑھتا ہے۔ اسی طرح یہ لفظ اس التفات و توجہ کے لیے بھی آتا ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی طرف فرماتا ہے۔ اس صورت میں اس کے معنی الطاف و عنایات الٰہی کے ہو جاتے ہیں۔ لفظ کی روح تو ایک ہی رہتی ہے لیکن نسبت کے بدل جانے سے ایک میں نیازمندی کا اور دوسرے میں لطف و عنایت کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کا ترجمہ ہم نے "عنایتیں" کیا ہے۔ نسبت کے بدل جانے سے الفاظ کے مفہوم میں اس قسم کی تبدیلیوں کی مثالیں عربی زبان میں بہت ملتی ہیں۔ یہاں ان صابرین کے لیے جس عنایت و رحمت اور جس ہدایت کی بشارت ہے اس کا تعلق دین اور دنیا اور دنیا اور آخرت، جیسا کہ اوپر گزرا، دونوں ہی سے ہے۔ صبر و استقامت سے اہل ایمان اپنے رب کے افضال و عنایات کے مستحق قرار پاتے ہیں اور انہی افضال و عنایات سے انہیں اس صراط مستقیم کی ہدایت حاصل ہوتی ہے جو دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کی ضامن بنتی ہے۔

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ (۱۵۸)

اصل سلسلۂ کلام کی طرف رجوع

یہ آیت اصل سلسلۂ بحث یعنی قبلہ کی بحث سے متعلق ہے، اوپر والا مضمون، جیسا کہ واضح ہوا، ضمناً محض ایک تنبیہ کے طور پر آ گیا تھا کہ یہ قبلہ کی تبدیلی کوئی معمولی تبدیلی نہیں ہے بلکہ یہ مسلمانوں کے لیے بہت سی آزمائشوں کا پیش خیمہ ہے جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے صبر اور نماز وسیلۂ کار ہیں۔ اس ضمنی مضمون کے بعد اصل سلسلہ بحث کو پھر لے لیا اور صفا و مروہ کے شعائر اللہ میں سے ہونے اور ان سے متعلق احکام و ہدایات کا ذکر فرمایا۔ اس لیے کہ یہود نے جس طرح بیت اللہ کے قبلہ ابراہیمؑ ہونے کے معاملہ کو چھپانے کی کوشش کی، جس کا ذکر تفصیل سے اوپر ہو چکا ہے، اسی طرح مروہ کو بھی جو حضرت ابراہیمؑ کی اصل قربان گاہ ہے، چھپانے کی کوشش کی جس کی تفصیل آگے والی آیت کے تحت آ رہی ہے۔

اصل مقام قربانی مروہ ہے۔

صفا اور مروہ بیت اللہ کے پاس کی وہ دونوں پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان حج و عمرہ کے موقع پر سعی کی جاتی ہے۔ مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب "الرای الصحیح فی من ھو الذبیح" میں پوری تفصیل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ اصل قربان گاہ، جہاں حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کی، یہی مروہ ہے[۱]۔ جس کا ذکر تورات

---

[۱] یہ واضح رہے کہ اصل قربان گاہ تو یہی مروہ ہے لیکن امت کی وسعت کے پیش نظر اس کو منیٰ تک وسعت دے دی گئی۔ اس سلسلے کی تفصیلات کے لیے استاذ مرحوم کا رسالہ ذبیح ملاحظہ فرمائیے۔

میں آیا ہے لیکن یہود نے بیت اللہ سے حضرت ابراہیمؑ کا تعلق کاٹ دینے کے لیے اس لفظ کو تحریف کر کے کچھ سے کچھ کر دیا۔

شعائر سے مقصود

شعائر، شعیرہ کی جمع ہے۔ جس کے معنی کسی ایسی چیز کے ہیں جو کسی حقیقت کا احساس دلانے والی، اور اس کا مظہر اور نشان (Symbol) ہو۔ اصطلاح دین میں اس سے مراد شریعت کے وہ مظاہر ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے کسی معنوی حقیقت کا شعور پیدا کرنے کے لیے بطور ایک نشان اور علامت کے مقرر کیے گئے ہوں۔ ان مظاہر میں مقصود بالذات تو وہ حقائق ہوا کرتے ہیں جو ان کے اندر مضمر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ مقرر کیے ہوئے اللہ اور رسول کے ہوتے ہیں اس وجہ سے ان حقائق کے تعلق سے یہ مظاہر بھی تقدیس کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ مثلاً قربانی حقیقتِ اسلام کا ایک مظہر ہے۔ اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالہ کر دے۔ اپنی کوئی محبوب سے محبوب چیز بھی اس سے دریغ نہ رکھے۔ اس حقیقت کا عملی مظاہرہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کی قربانی کر کے فرمایا، وہ تاریخ انسانی کا ایک بے نظیر واقعہ ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی یادگار میں جانوروں کی قربانی کو ایک شعیرہ کے طور پر مقرر فرما دیا تاکہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کے اندر اسلام کی اصل حقیقت برابر تازہ ہوتی رہے۔

اسی طرح حجر اسود ایک شعیرہ ہے۔ یہ پتھر حضرت ابراہیمؑ کے عہد سے اس روایت کا ایک نشان ہے کہ اس کو بوسہ دے کر یا اس کو ہاتھ لگا کر بندہ اپنے رب کے ساتھ اپنے عہد بندگی اور اپنے میثاق اطاعت کی تجدید کرتا ہے۔ چنانچہ بعض حدیثوں میں اس کو یمین اللہ (خدا کا ہاتھ) سے تعبیر کیا گیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بندہ جب اس کو ہاتھ لگاتا ہے تو گویا وہ خدا کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر اس سے تجدید بیعت کرتا ہے۔ اور جب اس کو بوسہ دیتا ہے تو گویا یہ اس کی طرف سے خدا کے ساتھ عہد محبت و وفاداری کا اظہار ہوتا ہے۔

اسی طرح جمرات بھی شعائر اللہ میں سے ہیں۔ یہ نشانات اس لیے قائم کیے گئے ہیں کہ حجاج ان پر کنکریاں مار کر اپنے اس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ بیت اللہ کے دشمنوں اور اسلام کے دشمنوں پر، خواہ وہ ابلیس کی ذریات سے تعلق رکھنے والے ہوں یا انسانوں کے کسی گروہ سے، لعنت کرتے ہیں اور ان کے خلاف جہاد کے لیے ہر وقت مستعد ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس بیت اللہ بھی ایک شعیرہ بلکہ سب سے بڑا شعیرہ ہے جو پوری امت کا قبلہ اور توحید و نماز کا مرکز ہے۔ اس کے ارد گرد طواف کر کے اور اپنی نمازوں اور اپنی تمام مسجدوں کا اس کو قبلہ قرار دے کر ہم اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ جس خدائے واحد کی عبادت کے لیے یہ گھر تعمیر ہوا ہم اسی کے بندے، اسی کی طرف رخ کرنے والے، اسی کے عبادت گزار اور اسی کی شمع توحید پر پروانہ وار نثار ہیں۔

اسی طرح صفا اور مروہ بھی اللہ تعالیٰ کے شعائر میں سے ہیں۔ ان کے شعائر میں سے ہونے کی وجہ

عام طور پر تو یہ بیان کی جاتی ہے کہ انھی دونوں پہاڑیوں کے درمیان حضرت ہاجرہ نے حضرت اسمٰعیلؑ کے لیے پانی کی تلاش میں تگ ودو کی تھی لیکن استاذ امامؒ کا رجحان اس بات کی طرف ہے کہ اصل قربان گاہ مروہ ہے، یہیں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں فرمانبردارانہ اور غلامانہ سرگرمی دکھائی اس وجہ سے ان دونوں پہاڑیوں کو شعائر میں سے قرار دے دیا گیا اور ان کی سعی کی یادگار ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دی گئی۔

ان شعائر سے متعلق چند اصولی باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔

شعائر سے متعلق چند اصولی باتیں

ایک یہ کہ یہ شعائر، اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ ہیں۔ کسی دوسرے کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے طور پر کسی چیز کو دین کے شعائر میں سے قرار دے دے یا جو چیز شعائر میں داخل ہے اس کو شعائر کی فہرست سے خارج کر دے۔ دین میں اس قسم کے من مانے تصرفات سے شرک و بدعت کی راہیں کھلتی ہیں جن قوموں نے اپنے جی سے شعائر قرار دیے، تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے اس طرح شرک و بت پرستی کی راہیں کھول دیں۔

دوسری یہ کہ جس طرح شعائر اللہ کے مقرر کردہ ہیں اسی طرح اسلام میں ان شعائر کی تعظیم کے حدود بھی خدا اور رسول ہی کے مقرر کردہ ہیں۔ جس شعیرہ کی تعظیم کی جو شکل شریعت میں ٹھہرا دی گئی ہے وہی اس حقیقت کے اظہار کی واحد شکل ہے جو اس شعیرہ کے اندر مضمر ہے، اس سے ہر مُوا انحراف نہ صرف اس شعیرہ کی حقیقت سے انسان کو محروم کر دینے والی بات ہے بلکہ اس سے شرک و بدعت کے دروازے بھی کھل سکتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ حجر اسود ایک شعیرہ ہے۔ اس کی تعظیم کے لیے اس کو حالتِ طواف میں بوسہ دینے یا اس کو ہاتھ لگا کر ہاتھ کو چوم لینے یا اس کی طرف اشارہ کرنے کی شکلیں خود دین کے لانے والے کی طرف سے مقرر کر دی گئی ہیں۔ اگر کوئی شخص تعظیم کی صرف انہی شکلوں پر قناعت نہ کرے بلکہ تعظیم شعائر اللہ کے جوش میں وہ اس پتھر کے آگے گھٹنے ٹیکنے لگے یا اس کے سامنے نذریں پیش کرنے لگے یا اس پر پھول نثار کرنے لگے یا اس طرح کی کوئی اور حرکت کرنے لگے تو ان باتوں سے وہ نہ صرف یہ کہ اس حقیقت سے بالکل دور ہو جائے گا جو اس شعیرہ کے اندر مضمر ہے بلکہ وہ شرک و بدعت میں بھی مبتلا ہو جائے گا۔

تیسری یہ کہ ان شعائر میں اصل مطمح نظر وہ حقیقتیں ہوا کرتی ہیں جو ان کے اندر مضمر ہوتی ہے۔ ان حقیقتوں کے اظہار کے لیے یہ شعائر گویا قالب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے ملت کی زندگی کے لیے سب سے زیادہ ضروری کام یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے دلوں اور دماغوں میں یہ حقیقتیں برابر زندہ اور تازہ رکھی جائیں۔ اگر یہ اہتمام سرد پڑ جائے تو دین کی اصل روح نکل جاتی ہے، صرف قالب باقی رہ جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ لوگوں کی اصل توجہ صرف قوالب پر مرکوز ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دین صرف ایک مجموعۂ رسوم بن کے رہ جاتا ہے۔